ماہنامہ
اشراق
لاہور
جولائی ۲۰۲۴ء

1979 سے جاری شدہ
اشاعت کے 45 سال

زیرسرپرستی
جاوید احمد غامدی

مدیر
طالب محسن

مدیر انتظامی
جواد احمد غامدی

”مذہب کا مقصد انسان کے علم و عمل اور اُس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا تزکیہ ہے۔ اُس کے مشمولات میں شریعت کی اصطلاح جن چیزوں کے لیے اختیار کی گئی ہے، وہ عبادات ہیں، تطہیر بدن کے احکام ہیں، تطہیر خورونوش اور تطہیر اخلاق کی ہدایات ہیں، اور یہ سب چیزیں بھی اصلاً اِس دنیا کے لیے نہیں، بلکہ آخرت کے لیے مطلوب ہیں۔ خدا کا فیصلہ ہے کہ اُس کا فردوس اُنھی لوگوں کے لیے ہے جو اپنا یہ تزکیہ کریں گے۔ اِس سے آگے مذہب کو کسی چیز سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔“

—— شذرات

- زندگی موت سے، خوشی غم سے، لذت الم سے، اطمینان اضطراب سے، راحت تکلیف سے اور نعمت اِس دنیا میں کبھی نقمت سے الگ نہیں ہوتی۔ اِنھیں زوجین کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ لگا دیا گیا ہے۔ (شذرات)
- دنیوی تمنائیں: ہماری روزی روٹی، ہمارے گھریلو حالات، ہمارے معیار زندگی اور ہماری ترقی، غرض دنیوی زندگی کی فلاح و بہبود سے متعلق ہوتی ہیں۔ ہمیں اس کا تجربہ ہوتا ہے اور زندگی کے کئی مواقع پر ہوتا ہے کہ ہماری تدبیر اور کوشش بار آور نہیں ہوتی۔ چنانچہ ہم ایسے راستوں کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں جو تدبیر اور محنت کے اس عمل کو کامیابی سے ہم کنار کر دیں۔ (شذرات)
- خدا کا سچا دین انسانوں کے لیے دین رحمت ہے۔ وہ بندوں کے نام خدائے رحمٰن اور رحیم کا ایک خوب صورت تحفہ ہے، اِلّا یہ کہ آدمی خود دین رحمت کو اپنے لیے دین زحمت بنانے پر کمربستہ ہو جائے۔ (اصلاح و دعوت)

المورد
ادارۂ علم و تحقیق

المورد

ادارۂ علم و تحقیق

المورد ملت اسلامیہ کی عظیم علمی روایات کا امین ایک منفرد ادارہ ہے۔ پندرھویں صدی ہجری کی ابتدا میں* یہ ادارہ اِس احساس کی بنا پر قائم کیا گیا ہے کہ تفقہ فی الدین کا عمل ملت میں صحیح نہج پر قائم نہیں رہا۔ فرقہ دارانہ تعصّبات اور سیاست کی حریفانہ کشمکش سے الگ رہ کر خالص قرآن و سنت کی بنیاد پر دین حق کی دعوت مسلمانوں کے لیے اجنبی ہو چکی ہے۔ قرآن مجید جو اِس دین کی بنیاد ہے، محض حفظ و تلاوت کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ دینی مدرسوں میں وہ علوم مقصود بالذات بن گئے ہیں جو زیادہ سے زیادہ قرآن مجید تک پہنچنے کا وسیلہ ہو سکتے تھے۔ حدیث، قرآن و سنت میں اپنی اساسات سے بے تعلق کر دی گئی ہے اور سارا زور کسی خاص مکتب فکر کے اصول و فروع اور دوسروں کے مقابلے میں اُن کی برتری ثابت کرنے پر ہے۔

المورد کے نام سے یہ ادارہ اِس صورت حال کی اصلاح کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اِس ادارے کا بنیادی مقصد دین کے صحیح فکر کی تحقیق و تنقید، تمام ممکن ذرائع سے وسیع پیمانے پر اُس کی نشر و اشاعت اور اُس کے مطابق لوگوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے۔

اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے، اُس کے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ عالمی سطح پر تذکیر بالقرآن کا اہتمام کیا جائے۔

۲۔ قرآن و سنت کے مطابق خدا کی شریعت اور ایمان و اخلاق کی تعلیم دی جائے۔

۳۔ دین کے صحیح الفکر علما اور محققین کو فیلو کی حیثیت سے ادارے کے ساتھ متعلق کیا جائے اور اُن کے علمی، تحقیقی اور دعوتی کاموں کے لیے اُنھیں ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں۔

۴۔ لوگوں کو آمادہ کیا جائے کہ جہاں جہاں ممکن ہے:

ا۔ اسلامی علوم کی ایسی درس گاہیں قائم کریں جن کا مقصد دین کے صحیح الفکر علما اور محققین تیار کرنا ہو۔

ب۔ ایف اے، ایف ایس سی اور اے لیول تک نہایت اعلیٰ معیار کے اسکول قائم کریں جن میں تعلیم و تعلم کے ساتھ طالب علموں کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشو و نما اور اُن کی دینی اور تہذیبی تربیت بھی پیش نظر ہو۔

ج۔ عام اسکولوں کے طلبہ کی دینی تعلیم کے لیے ایسے ہفتہ وار مدارس قائم کریں جن میں قرآن کی دعوت خود قرآن ہی کے ذریعے سے طالب علموں کے ذہن میں اِس طرح راسخ کر دی جائے کہ بعد کے زمانوں میں وہ پورے شرح صدر کے ساتھ اپنے دین پر قائم رہ سکیں۔

د۔ ایسی خانقاہیں قائم کریں جہاں لوگ وقتاً فوقتاً اپنے دنیوی معمولات کو چھوڑ کر آئیں، علما و صالحین کی صحبت سے مستفید ہوں، اُن سے دین سیکھیں اور چند روز کے لیے یک سوئی کے ساتھ ذکر و عبادت میں مشغول رہ کر اپنے لیے پاکیزگیِ قلب و نظر کا اہتمام کریں۔

---

* شعبان ۱۴۰۳ھ بمطابق جون ۱۹۸۳ء۔

ماہنامہ
اشراق
لاہور

زیرسرپرستی
جاوید احمد غامدی

مدیر
طالب محسن

مدیر انتظامی
جواد احمد غامدی

جلد ۳۶ شمارہ ۷ جولائی ۲۰۲۴ء محرم الحرام ۱۴۴۶ھ

فہرست

شذرات		
الحاد کا مقدمہ	جاوید احمد غامدی	۴
دین سازی	طالب محسن	۱۳
قرآنیات		
البیان: الزمر ۳۹: ۱-۲۰ (۱)	جاوید احمد غامدی	۱۵
معارف نبوی		
نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد مسلم حکومتیں	حدیث سیل / شاہد رضا	۲۶
مقالات		
’لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ‘؟ (۴)	ساجد حمید	۳۱
نسخ القرآن بالسنۃ: امام شافعی کے موقف پر اصولیین کے معارضات	ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر	۴۳
سیر و سوانح		
مہاجرین حبشہ (۳۲)	محمد وسیم اختر مفتی	۵۳
اصلاح و دعوت		
زوالِ آدمِ خاکی	محمد ذکوان ندوی	۶۵
یسئلون		
غیر مسلم اور زکوٰۃ اور قربانی کا گوشت	کوکب شہزاد	۶۹
وحی اور سائنس کا ٹکراؤ	معاذ بن نور	۷۴
غیر مسلم کے ساتھ کھانا پینا	شاہد رضا	۷۹
شخصیات		
حیات امین احسن (۱۰)	محمد بلال	۸۰

مجلس علمی

ڈاکٹر منیر احمد
محمد رفیع مفتی
طالب محسن
محمد وسیم اختر مفتی
ڈاکٹر عبید الرحمٰن
ڈاکٹر ساجد حمید
ڈاکٹر شہزاد سلیم
آصف افتخار
ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر
خورشید احمد ندیم
اظہار احمد
کوکب شہزاد
جنید حسن
مشفق سلطان

مجلس ادارت

شاہد رضا
نعیم احمد

Post Box 5185, Lahore, Pakistan.
https://www.javedahmedghamidi.org/#!/ishraq
https://www.javedahmadghamidi.com
https://www.facebook.com/javedahmadghamidi
https://www.facebook.com/monthlyishraq

جاوید احمد غامدی

الحاد کا مقدمہ

مذہب جس خدا پر ایمان کی دعوت دیتا ہے، اُس کے مقابل میں وہ لوگ ہمیشہ رہے ہیں جو ہماری اِس کائنات ہی کو انسان کا خالق سمجھتے ہیں۔ اِسے الحاد کہا جاتا ہے۔ سترھویں صدی سے پہلے مذہب اور مذہبی فکر کا سیاسی غلبہ عالمی سطح پر قائم تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد کم و بیش ایک ہزار سال تک یہ غلبہ اِسی طرح قائم رہا۔ الہامی صحائف میں اِس کی مدت یہی بیان ہوئی ہے۔[1] یہ خدا کے فرستادوں کی پیشین گوئی تھی، لہٰذا حرف بہ حرف پوری ہوئی، اور اب یہ غلبہ پوری دنیا میں ختم ہو چکا ہے۔ اِس سے جو فضا پیدا ہوئی ہے، اُس میں الحاد کے علم بردار بڑی تعداد میں نمایاں ہو گئے ہیں اور مذہب کے خلاف اپنا مقدمہ پورے یقین و اذعان کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔ یہ مقدمہ جن اعتراضات کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے، وہ بنیادی طور پر چار ہی ہیں۔ اِن کا جواب قرآن نے جس طرح دیا ہے، ہم یہاں اُس کی وضاحت کریں گے:

پہلا اعتراض یہ ہے کہ خدا کا تصور انسان کے فکری ارتقا کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ قرآن جس خدا کا تعارف کراتا ہے، اُس کے کوئی آثار انسان کی ابتدائی تاریخ میں نہیں ملتے۔ اُس کو جہاں سے دیکھیے، شرک کے مظاہر اُس میں ہر جگہ موجود ہیں، مگر توحید کسی جگہ نظر نہیں آتی۔ چنانچہ واقعہ یہی ہے کہ ایک خدا کا تصور اِس تاریخ میں بہ تدریج نمایاں ہوا ہے، اور وہ بھی اُس کے پیش کرنے والوں کے حالات کی رعایت سے کسی جگہ بادشاہ، کسی جگہ غیور شوہر اور کسی جگہ غریبوں کے ہم درد کسی مذہبی رہنما کی حیثیت سے۔ پھر یہی نہیں، مشرکانہ

۱۔ کلام مقدس، مکاشفہ ۲۰: ۷-۹۔

مذاہب کے مراسم عبودیت بھی وہ اِس سفر سے اپنے ساتھ لے کر آیا ہے، اور ہر زمانے میں اِنھی کو اپنے لیے خاص کرنے کا مطالبہ کرتا رہا ہے۔ اِس کے بعد کس طرح ممکن ہے کہ انسانوں کے بنائے ہوئے اِس خدا کو کوئی عاقل اپنا خالق و مالک اور معبود ماننے کے لیے تیار ہو جائے؟

اِس اعتراض کے جواب میں عرض ہے کہ ارتقا کا یہ افسانہ محض افسانہ ہی ہے۔ اِس کی کوئی بنیاد حقائق کی دنیا میں تلاش نہیں کی جاسکتی۔ انسان کے مذہبی فکر کی تاریخ سے متعلق جو معلومات اب تک حاصل ہوئی ہیں، اُن کی رو سے اِس کو زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار سال تک پیچھے لے جاسکتے ہیں۔ لیکن زمین پر انسان کی عمر بھی کیا یہی ہے؟ اِس سے متعلق جو تحقیقات اب تک ہوئی ہیں، اُن کی روشنی میں اِس کا کم سے کم اندازہ بھی اگر لگایا جائے تو یہ اِس سے ہزاروں سال پہلے کا واقعہ ہے۔ اِس کے بعد کیا چیز ہے جو قرآن کے اِس بیان کو جھٹلا دے سکتی ہے کہ انسان ابتدا میں ایک ہی مذہب پر تھے۔ اِس کی ہدایت اُنھیں خود اُن کے پروردگار نے دی تھی۔ اُن کے مذہبی فکر میں انحرافات اِس کے بعد کسی زمانے میں داخل ہوئے، جس کے نتیجے میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ شرک اِسی دور کی چیز ہے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ مذہبی فکر کا سفر شرک سے توحید کی طرف نہیں، بلکہ توحید سے شرک کی طرف ہوا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ. (یونس ۱۰: ۱۹)

”حقیقت یہ ہے کہ لوگ ایک ہی امت تھے، اُنھوں نے بعد میں اختلاف کیا، اور اگر تیرے پروردگار کی طرف سے ایک بات[۲] پہلے طے نہ کر لی گئی ہوتی تو اِن کے درمیان اُس چیز کا فیصلہ کر دیا جاتا، جس میں یہ اختلاف کر رہے ہیں۔“

پچھلے دو ہزار سال کی تاریخ بھی اِسی حقیقت کی گواہی دیتی ہے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ اِس تاریخ کی ابتدا خدا کے دو جلیل القدر پیغمبروں —— مسیح اور محمد —— کی طرف سے توحید کی منادی سے ہوئی تھی۔ مگر اس کے بعد دیکھ لیجیے کہ فلسفہ اور تصوف کی آمیزش نے اُن کی تعلیمات میں کیا کیا انحرافات پیدا کر دیے ہیں، یہاں تک کہ خود مسیح علیہ السلام کے پیرو اُن کو خدا کا بیٹا اور اُن کی ماں کو مادر خدا بنا کر اُن سے دعا و مناجات کرتے نظر آتے ہیں، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرووں میں بھی ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں، جو احمد کے پردے میں احد کو دیکھتے

۲۔ یعنی یہ بات کہ اختلافات کا حتمی فیصلہ قیامت کے دن سنایا جائے گا۔

اور ذوق و مستی کے عالم میں پکار اٹھتے ہیں:

وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہو کر

اتر پڑا ہے مدینے میں مصطفیٰ ہو کر

اِس کے بعد یہ حقیقت محتاج دلیل نہیں رہتی کہ مراسم عبودیت بھی اصلاً خدا کی طرف سے اور خدا ہی کے لیے مقرر کیے گئے تھے، مگر شرک نے جب اپنے معبود تخلیق کیے تو بعض ترامیم کے ساتھ اُنھی کو اپنے اُن معبودوں کے لیے بھی اختیار کر لیا۔ چنانچہ پیغمبروں کی بعثت ہوئی تو لوگوں سے جو سب سے بڑا مطالبہ اُن کی دعوت میں کیا گیا، وہ یہی تھا کہ لوگو، یہ مراسم عبودیت صرف خدا کے لیے خاص ہیں اور اُسی کے لیے خاص رہنے چاہییں، اِس لیے کہ تنہا وہی تمھارا پروردگار، وہی کائنات کا بادشاہ اور وہی معبود ہے، اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔

رہی یہ بات کہ الہامی صحائف میں خدا کا تصور بہ ظاہر متفاوت نظر آتا ہے تو اِس کی وجہ محض سوء فہم ہے۔ یہ صحائف ادب عالیہ کا بہترین نمونہ ہیں۔ لہٰذا ایک ایک مقام پر اِن کی آیات کو اِن کے مرتبین کے تاریخی بیانات سے الگ کر کے دکھایا جا سکتا ہے کہ لوگوں نے کس قلت علم، قلت تدبر اور کس بے ذوقی کے ساتھ اِن کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے، اور اِس طرح اِن کا سارا حسن اپنی تشریحات سے غارت کر دیا ہے۔ اِس کے بعد یہی کہا جا سکتا ہے کہ: شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ مذہب کو لوگوں نے جس طرح سمجھا اور اُس کے نتیجے میں جو مذہبی فکر وجود میں آیا ہے، وہ ایک مجموعۂ تضادات ہے۔ اُس میں نہ خدا کے تصور پر اتفاق ہے، نہ اُس کی صفات اور اُس کے افعال پر، نہ انسان کے ساتھ اُس کے معاملہ کرنے کے طریقے پر، نہ اُس کے احکام و ہدایات پر، نہ انسان سے اُس کے مطالبات پر، نہ انسان اور کائنات کے بارے میں اُس کے مزعومات پر، گویا وہی معاملہ ہے کہ: لائے ہیں بزم ناز سے یار خبر الگ الگ۔ اِس کے بعد کسی عاقل سے کیا یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اِس مجموعۂ تضادات کو وہ کسی بھی درجے میں قابل التفات سمجھے گا یا اِس پر ایمان لائے گا؟

اِس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ وجودی حقائق کے ادراک اور اُن سے اخذ و استدلال کی جو صلاحیت انسان کو عطا ہوئی ہے، یہ اختلافات اُس کا لازمی نتیجہ ہیں۔ انسان نے جو کمالات اِس دنیا میں اب تک دکھائے ہیں، وہ سب اِسی صلاحیت کا فیضان ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اِس کے سوء استعمال سے مسائل پیدا ہوئے ہیں، لیکن غور کیجیے تو

انسان کا اصلی شرف یہی صلاحیت ہے۔ انسان اِسی سے انسان ہے۔ اُس کے خالق نے اُس کو اِسی طرح بنایا ہے اور آگے بھی اِسی کے ساتھ حیات ابدی کی بشارت دی ہے۔ اِس کے بعد کس طرح توقع کی جا سکتی ہے کہ اپنی ہدایت کے فہم میں وحدت پیدا کرنے کے لیے وہ انسان سے یہ صلاحیت سلب کر لے گا؟ ہرگز نہیں، اُس نے صاف فیصلہ سنا دیا ہے کہ 'لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ'، [3] دین کے معاملے میں کسی پر کوئی جبر نہیں کیا گیا اور نہ آیندہ کبھی کیا جائے گا۔

تاہم اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان کو اِس کے نتیجے میں اختلافات کی بھول بھلیاں میں سرگرداں رہنے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ خدا کا دین تو ایک ہی ہے اور اُس کا نام بھی ہمیشہ سے "اسلام" ہی رہا ہے، لیکن اُس کے سمجھنے میں یہ صورت حال جیسے ہی پیدا ہوئی تھی، خدا نے ہر قوم میں اپنے پیغمبر بھیجنا شروع کر دیے اور اُن کے ساتھ اپنی کتابیں بھی نازل کر دی تھیں۔ یہ کتابیں حق و باطل میں امتیاز کے لیے میزان اور فرقان کی حیثیت سے نازل کی گئیں تاکہ لوگ اِن کے ذریعے سے اپنے اختلافات کا فیصلہ کر سکیں اور اِس طرح حق کے معاملے میں ٹھیک انصاف پر قائم ہو جائیں۔ ارشاد فرمایا ہے:

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۣ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۠ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ. (البقرہ ۲: ۲۱۳)

"لوگ ایک ہی امت تھے، پھر (اُن میں اختلاف پیدا ہوا تو) اللہ نے نبی بھیجے، بشارت دیتے اور انذار کرتے ہوئے اور اُن کے ساتھ قول فیصل کی صورت میں اپنی کتاب نازل کی تاکہ لوگوں کے درمیان وہ اُن کے اختلافات کا فیصلہ کر دے۔"

اِس سلسلہ کی آخری کتاب قرآن مجید ہے۔ دنیا کے الہامی لٹریچر میں اب تنہا یہی کتاب ہے، جس کے بارے میں یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ جس طرح دی گئی، بغیر کسی ادنیٰ تغیر کے بالکل اُسی طرح، اُسی زبان میں اور اُسی ترتیب کے ساتھ اِس وقت ہمارے پاس موجود ہے۔ اِس کا یہ تواتر خود ایک معجزہ ہے، اِس لیے کہ یہ دنیا کی واحد کتاب ہے، جس کو اِس وقت بھی لاکھوں مسلمان 'اَلْحَمْد' سے 'وَالنَّاس' تک محض حافظے کی مدد سے زبانی سنا سکتے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ پچھلے چودہ سو سال میں اِس کی روایت کا یہ سلسلہ ایک دن کے لیے بھی منقطع نہیں ہوا۔ اِس سے صاف واضح ہے کہ اِس کی حفاظت کا یہ اہتمام خود پروردگار عالم کی طرف

۳۔ البقرہ ۲: ۲۵۶۔

سے ہوا ہے۔ اِس کے جن پہلوؤں کی طرف خود قرآن نے جگہ جگہ توجہ دلائی ہے، وہ استاذ امام امین احسن اصلاحی کے الفاظ میں یہ ہیں:

”ایک یہ کہ قرآن کے زمانۂ نزول میں اللہ تعالیٰ نے اِس امر کا خاص اہتمام فرمایا کہ قرآن کی وحی میں شیاطین کوئی مداخلت نہ کر سکیں۔ یوں تو اِس نظام کائنات میں یہ مستقل اہتمام ہے کہ شیاطین ملاء اعلیٰ کی باتیں نہ سن سکیں، لیکن... نزول قرآن کے زمانے میں یہ اہتمام خاص طور پر تھا کہ شیاطین وحی الٰہی میں کوئی مداخلت نہ کر پائیں تاکہ اُن کو قرآن میں اس کے آگے سے (مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ)[4] کچھ گھسانے کا موقع نہ مل سکے۔

دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اِس کام کے لیے اپنے جس فرشتے کو منتخب کیا، اُس کی صفت قرآن میں ’ذِيْ قُوَّةٍ‘ مطاع، قوی، امین اور ’عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ‘ وارد ہوئی ہے۔ یعنی وہ فرشتہ ایسا زور آور ہے کہ ارواح خبیثہ اُس کو مغلوب نہیں کر سکتیں، وہ تمام فرشتوں کا سردار ہے، وہ کوئی چیز بھول نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو امانت اُس کے حوالے کی جاتی ہے، وہ اُس کو بالکل ٹھیک ٹھیک ادا کرتا ہے۔ مجال نہیں ہے کہ اُس میں زیر زبر کا بھی فرق واقع ہو سکے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت مقرب ہے، جو اِس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے تمام مخلوقات سے برتر ہے —— ظاہر ہے کہ یہ اہتمام بھی اِسی لیے فرمایا گیا ہے کہ قرآن میں اُس کے منبع کی طرف سے کسی باطل کے گھسنے کا امکان باقی نہ رہے۔

تیسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اِس امانت کو اٹھانے کے لیے جس بشر کو منتخب فرمایا، اول تو وہ ہر پہلو سے خود خیر الخلائق تھا، ثانیاً قرآن کو یاد رکھنے اور اُس کی حفاظت و ترتیب کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے تنہا اُس کے اوپر نہیں ڈالی، بلکہ یہ ذمہ داری اپنے اوپر لی۔ چنانچہ سورۂ قیامہ میں فرمایا ہے: ’لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ. اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ. فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ. ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ‘[5] (اور تم اِس قرآن کو حاصل کرنے کے لیے اپنی زبان کو تیز نہ چلاؤ، ہمارے اوپر ہے اِس کے جمع کرنے اور اِس کے سنانے کی ذمے داری۔ تو جب ہم اِس کو سنا چکیں تو اِس سنانے کی پیروی کرو، پھر ہمارے ذمہ ہے اِس کی وضاحت)۔ روایات سے ثابت ہے کہ جتنا قرآن نازل ہو چکا ہوتا، اُس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مقرب صحابہ یاد بھی رکھتے اور ہر رمضان میں حضرت جبریل کے ساتھ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُس کا مذاکرہ بھی فرماتے رہتے تاکہ کسی

۴۔ حٰمٓ السجدہ ۴۱: ۴۲۔

۵۔ ۷۵: ۱۶-۱۹۔

سہو و نسیان کا اندیشہ نہ رہے، اور یہ مذاکرہ اُس ترتیب کے مطابق ہوتا، جس ترتیب پر اللہ تعالیٰ نے قرآن کو مرتب کرنا پسند فرمایا۔ یہ بھی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات مبارک کے آخری رمضان میں یہ مذاکرہ دو مرتبہ فرمایا۔ پھر اسی ترتیب اور اِسی قراءت کے مطابق پورا قرآن ضبط تحریر میں لایا گیا اور بعد میں خلفاے راشدین نے اِس کی نقلیں مملکت کے دوسرے شہروں میں بھجوائیں۔ یہ اہتمام پچھلے صحیفوں میں سے کسی کو بھی حاصل نہ ہو سکا۔ یہاں تک کہ تورات کے متعلق تو یہ علم بھی کسی کو نہیں ہے کہ اُس کے مختلف صحیفے کس زمانے میں اور کن لوگوں کے ہاتھوں مرتب ہوئے۔

چوتھا یہ کہ قرآن اپنی فصاحت الفاظ اور بلاغت معنی کے اعتبار سے معجزہ ہے، جس کے سبب سے کسی غیر کا کلام اُس کے ساتھ پیوند نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا کلام بھی، باوجودیکہ آپ اِس قرآن کے لانے والے اور افصح العرب والعجم ہیں، اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اِس وجہ سے اِس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ کسی غیر کا کلام اُس کے ساتھ مخلوط ہو سکے۔ چنانچہ جن مدعیوں نے قرآن کا جواب پیش کرنے کی جسارت کی، اُن کے مزخرفات کے نمونے ادب اور تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ آپ اُن کو قرآن کے مقابل میں رکھ کر موازنہ کر لیجیے، دونوں میں گہر اور پشیز کا فرق نظر آئے گا —— اِس طرح گویا پیچھے سے بھی (وَلَا مِنۡ خَلۡفِهٖ)[6] قرآن میں دراندازی کی راہ مسدود کر دی گئی۔

پانچویں یہ کہ قرآن کی حفاظت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی زبان کی حفاظت کا بھی قیامت تک کے لیے وعدہ فرما لیا۔ دوسرے آسمانی صحیفوں میں تو اُن کی اصل زبانیں مٹ جانے کے سبب سے بے شمار تحریفیں ترجموں کی راہ سے داخل ہو گئیں، جن کا سراغ اب ناممکن ہے، لیکن قرآن کی اصل زبان محفوظ ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گی۔ اِس وجہ سے ترجموں اور تفسیروں کی راہ سے اُس میں کسی باطل کے گھسنے کا امکان نہیں ہے۔ اگر اُس میں کسی باطل کو گھسانے کی کوشش کی جائے گی تو اہل علم اصل پر پرکھ کر اُس کو چھانٹ کر الگ کر سکتے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۷/ ۱۱۲)

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ مذہب جس خدا کو ماننے کی دعوت دیتا ہے، اُس کے رویے نہایت ظالمانہ ہیں۔ وہ بچوں تک کو بیماریوں اور تکلیفوں سے رلا رلا کر مار ڈالتا ہے، لاکھوں اور کروڑوں جانوروں کو روزانہ انسانوں سے ذبح کراتا اور دوسرے جانوروں سے پھڑواتا ہے، وہ کسی قاتل اور ظالم کا ہاتھ نہیں پکڑتا، بلکہ اُنھیں ظلم وعدوان

۶۔ حٰم السجدہ ۴۱: ۴۲۔

کے مواقع فراہم کرتا ہے، بے شمار مخلوقات محض اِس لیے پیدا کرتا ہے کہ انسان اُنھیں سدھائیں اور اپنا محکوم بنائیں اور اُن کی ایک ایک چیز کو اپنے کام میں لائیں، یہاں تک کہ خود انسانوں کو انسانوں کے خلاف قتل و قتال کی ترغیب دیتا اور اُس پر اجر کے وعدے کرتا ہے۔ پھر یہی نہیں، اُس کی بنائی ہوئی یہ دنیا بھی ہر لحاظ سے کامل نہیں ہے۔ اِس میں زلزلے ہیں، بجلیاں ہیں، قحط ہیں، آلام ہیں، اور یہی نہیں، بعض جگہ نقائص بھی بتائے جا سکتے ہیں۔ اِس کے بعد کیسے مانا جائے کہ وہ کوئی رحمٰن و رحیم اور علیم و حکیم ہستی ہے، جس کا ذہن لامحدود اور قدرت بے پایاں ہے؟

اِس اعتراض کا جواب قرآن نے یہ دیا ہے کہ خدا کی صفات کمال اور صفات جلال و جمال کا ظہور جس دنیا میں اصلاً ہونا ہے، وہ ابھی پردۂ غیب میں ہے اور انسان کو اُسی دنیا کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اِس وقت جو عظیم کائنات اور اُس کی اربوں کہکشانیں، بہ ظاہر بے آب و گیاہ اُس کے سامنے بکھری ہوئی ہیں، یہ سب اُسی دنیا کا سامان تعمیر ہے اور سامان تعمیر ہی کی طرح بے کراں خلا میں بکھیر دیا گیا ہے۔ قرآن نے فرمایا ہے کہ وہ دن اب زیادہ دور نہیں ہے، جب اِسے ایک دوسرے زمین و آسمان میں بدل دیا جائے گا اور سب اللہ واحد و قہار کے سامنے نکل کھڑے ہوں گے۔[7] اِس کے بعد ایک نئی دنیا وجود میں آئے گی، جس کی وسعت پوری کائنات کی وسعت ہو گی۔ وہ خدا کی دنیوںت اور رحمت و عنایت کی دنیا ہے۔ ہم جس دنیا میں شعور کی آنکھ کھولتے ہیں، یہ اُسی کی تمہید ہے۔ اِسے نہ عدالت کے لیے برپا کیا گیا ہے اور نہ ظہور کمال کے لیے۔ اِس کا مقصد محض ابتلا ہے۔ یہاں تک کہ جن و انس سب عرصۂ امتحان میں ہیں۔ ارشاد فرمایا ہے:

الَّذِیۡ خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَالۡحَیٰوۃَ لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا وَھُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡغَفُوۡرُ. (الملک ۶۷:۲)

”وہی جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تم کو آزمائے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔ اور وہ زبردست بھی ہے اور درگذر فرمانے والا بھی۔“

چنانچہ اِسی کا نتیجہ ہے کہ زندگی موت سے، خوشی غم سے، لذت الم سے، اطمینان اضطراب سے، راحت تکلیف سے اور نعمت اِس دنیا میں کبھی نقمت سے الگ نہیں ہوتی۔ اِنھیں زوجین کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ لگا دیا گیا ہے۔ یہ ماضی کے پچھتاووں اور مستقبل کے اندیشوں کی دنیا ہے۔ انسان کو جو کچھ علم و دانش عطا ہوا ہے،

۷۔ ابراہیم ۱۴:۴۸۔

وہ اِسی حقیقت کو سمجھنے کے لیے عطا ہوا ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ اصل حکمت یہی ہے اور جس نے اِسے پالیا، اُس نے در حقیقت خیر کثیر کا ایک خزانہ پالیا ہے۔[8] اِس لیے کہ اِسی سے انسان اپنے حدود علم کو پہچانتا اور خدا کو مسئول ٹھیرانے کے بجاے اُس کے سامنے اعتراف عجز کے ساتھ اُس کی اسکیم کو سمجھنے کی کوشش کرتا اور ہر لحظہ دست بہ دعا رہتا ہے کہ: 'رَبِّ زِدۡنِیۡ عِلۡمًا'[9]، پروردگار، میرا علم زیادہ کر دے۔ علم و فلسفہ کی سب سے بڑی محرومی اِسی حکمت سے محرومی ہے۔ خدا پر یہ اعتراض اِسی سے پیدا ہوتا اور انسان کو ہمیشہ کے لیے اُن ظلمتوں کے حوالے کر دیتا ہے، جن کے آگے پھر کوئی روشنی نہیں ہے۔

چوتھا اعتراض یہ ہے کہ انسان کے زمانۂ طفولیت میں، ہو سکتا ہے کہ اُس کو مذہب کی ضرورت رہی ہو، لیکن اب وہ عاقل و بالغ ہے، اُس نے تجربے، مشاہدے، استقرا اور استنباط پر مبنی اپنے علم اور اپنی سائنس کے ذریعے سے ہر مشکل کو حل کرنے کی کلید دریافت کر لی ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش میں پھیلی ہوئی کائنات کو بھی بڑی حد تک سمجھنے لگا ہے، اور اُس نے معاشرے کی تنظیم اور سیاست و معیشت کی ضرورتوں کے لیے بھی نہایت اعلیٰ اقدار پر مبنی سماجی تشکیلات پیدا کر لیں اور ادارے بنا لیے ہیں، جن کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انسان کا اپنا علم اُن شرائع کے مقابل میں کتنا بلند و برتر ہے، جن کا قلادہ وہ مذہب کے نام پر صدیوں سے اپنی گردن میں ڈالے ہوئے تھا۔ اِس کے بعد کون ہے جو اِن شرائع کو کسی بھی درجے میں قبول کرنے کے لیے تیار ہو گا؟

اس اعتراض کے جواب میں عرض ہے کہ اِس طرح کا تقابل وہی لوگ کر سکتے ہیں، جو مذہب سے ناواقف محض ہوں۔ اِس لیے کہ مذہب کی ہدایت اِن میں سے کسی چیز کے لیے کبھی دی ہی نہیں گئی۔ وہ نہ اِس لیے نازل کیا گیا ہے کہ انسان کو سائنس کے قوانین سمجھائے، نہ اِس لیے کہ اُس کی طبی ضروریات پوری کرے اور نہ اِس لیے کہ معاشرے کی تنظیم اور سیاست و معیشت کی ضرورتوں کے لیے اُس کو سماجی تشکیلات پیدا کرنا اور ادارے بنانا سکھائے۔ چنانچہ انسان نے جو کچھ اِس دنیا میں آ کر کیا ہے، وہ انسان ہی کو کرنا تھا۔ اُس کے خالق نے اِس کے لیے اُسے غیر معمولی قوتیں اور صلاحیتیں دے کر پیدا کیا ہے۔ مذہب کا مقصد انسان کے علم و عمل اور اُس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا تزکیہ ہے۔ اُس کے مشمولات میں شریعت کی اصطلاح جن چیزوں کے لیے اختیار کی گئی ہے، وہ عبادات ہیں، تطہیر بدن کے احکام ہیں، تطہیر خور و نوش اور تطہیر اخلاق کی ہدایات ہیں، اور یہ سب چیزیں

۸۔ البقرہ ۲: ۲۶۹۔

۹۔ طٰہٰ ۲۰: ۱۱۴۔

بھی اصلاً اِس دنیا کے لیے نہیں، بلکہ آخرت کے لیے مطلوب ہیں۔ خدا کا فیصلہ ہے کہ اُس کا فردوس اُنھی لوگوں کے لیے ہے جو اپنا یہ تزکیہ کریں گے۔ اِس سے آگے مذہب کو کسی چیز سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ لہٰذا خدا کی شریعت کو سمجھنا ہے تو اُس کے اِس مقصد اور اِس نصب العین کے لحاظ سے سمجھا جائے گا۔ اُس کی ضرورت کا فیصلہ بھی لازماً اِسی لحاظ سے ہو گا اور دنیا کے علوم و فنون میں اُس کا درجہ اور مرتبہ بھی اِسی رعایت سے متعین کیا جائے گا۔ چنانچہ دیکھیے، فرمایا ہے:

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ.(الجمعہ ۶۲: ۲)

”اُسی نے امیوں کے اندر ایک رسول اُنھی میں سے اٹھایا ہے جو اُس کی آیتیں اُنھیں سناتا ہے اور اُن کا تزکیہ کرتا ہے، اور اِس کے لیے اُنھیں قانون اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس سے پہلے یہ لوگ کھلی گم راہی میں تھے۔“

طالب محسن

دین سازی

تاریخوں میں لکھا ہے کہ مغل بادشاہ اکبر نے ہندوستان میں مذہبی ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے ایک نیا دین رائج کرنا چاہا۔ اس دین سازی کا محرک، جیسا کہ بالعموم لکھا گیا ہے، سیاسی مصالح تھے۔ اس کے مشمولات کو سامنے رکھیں تو یہ پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے کہ یہ دین الٰہی اخلاقی اقدار اور روحانی اہداف سے مرتب کیا گیا تھا۔ مسلمانوں نے بجا طور پر اس دین کو رد کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ دین خود ساختہ تھا اور مسلمان اس دین کو مانتے ہیں جو دین اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا ہے۔

یہ واقعہ چونکہ بادشاہ کی طرف سے ہوا تھا، اس لیے تاریخ کے صفحات پر رقم ہوا۔ مغل بادشاہوں کی تاریخ پڑھنے والے اس سے واقف ہو جاتے ہیں اور اسے ایک بڑے انحراف کے طور پر دیکھتے ہیں۔ اس طرح کے متعدد انحرافات ہیں جو مسلم مذہبی تاریخ کا حصہ ہیں، لیکن ان کو ان کی لمبی تاریخ کی وجہ سے مان لیا گیا ہے اور ان کے خلاف اور ان کے حق میں گفتگو اب ہمارے معمولات کا حصہ ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس طرح کے انحرافات کو قبول یا رد کرنے کا معیار کیا ہے؟ اسی سے جڑا ہوا دوسرا سوال یہ ہے کہ ان انحرافات کے محرکات کیا ہیں؟ یہ دوسرا سوال اس وجہ سے اہم ہے کہ ہمارا دین قرآن و سنت سے اخذ کیا جاتا ہے۔ قرآن و سنت کی محکم اساسات کے باوجود یہ انحراف کیوں؟

قرآن مجید میں یہود و نصاریٰ کے انحرافات زیر بحث آئے ہیں۔ اہل عرب کے مشرکانہ عقائد اور مبتدعانہ اعمال کا تذکرہ ہوا ہے۔ قرآن مجید کو پڑھنے سے دو باتیں بالکل واضح ہو جاتی ہیں: ایک یہ کہ یہ انحرافات وحی سے دین اخذ نہ کرنے کا نتیجہ ہیں، یعنی کسی پیغمبر کی تعلیم کے بجائے اپنے خیال سے کوئی عقیدہ و عمل گھڑ لینا۔ اہل شرک

سے یہ سوال قرآن میں کئی بار کیا گیا ہے کہ کیا میں نے بتایا ہے کہ فلاں اور فلاں کار خدائی میں شریک ہیں۔

دوسری بات یہ واضح ہوتی ہے کہ انحرافات کا سبب انسان کی تمنائیں ہیں۔ انسان کے مذہبی اعمال کا تجزیہ کریں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تمنائیں صرف دنیوی نہیں ہیں، جو اسے دین حق سے منحرف کر دیتی ہیں، بلکہ یہ دینی تمنائیں بھی ہیں، جو انحرافات کا سبب بنتی ہیں۔

دنیوی تمنائیں: ہماری روزی روٹی، ہمارے گھریلو حالات، ہمارے معیار زندگی اور ہماری ترقی، غرض دنیوی زندگی کی فلاح و بہود سے متعلق ہوتی ہیں۔ ہمیں اس کا تجربہ ہوتا ہے اور زندگی کے کئی مواقع پر ہوتا ہے کہ ہماری تدبیر اور کوشش بار آور نہیں ہوتی۔ چنانچہ ہم ایسے راستوں کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں جو تدبیر اور محنت کے اس عمل کو کامیابی سے ہم کنار کر دیں۔ چنانچہ چلے، وظیفے، بزرگوں کے مزاروں پر حاضری، تعویذ اور جھاڑ پھونک وغیرہ سے تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ہر مذہب میں اس کی اپنی مذہبی کتابوں، مذہبی روایات اور مذہبی شخصیات سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ اگر ہم قرآن مجید اور سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالعہ کریں تو اس طرح کے کسی طریقے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ لیکن مسلمانوں میں یہ تمام اعمال اسلامی اعمال کی حیثیت سے جاری ہیں۔

دینی تمنائیں: جنت کا حصول، خدا کی خوشنودی، قرب الٰہی، امور غیب تک رسائی، تقدیر پر قابو، مستجاب الدعا ہونا وغیرہ۔ دنیوی تمناؤں کی طرح یہ تمنائیں بھی صرف ان طریقوں تک محدود نہیں رہنے دیتیں جو قرآن وسنت سے ہمیں ملتا ہے۔ چنانچہ اس کے لیے بھی عقائد و اعمال کا ایک پورا نظام تخلیق کر لیا جاتا ہے، اور دین ہی کے نام سے اس کو مانا اور اپنایا جاتا ہے۔

سبب خواہ کچھ ہو، اصل یہ ہے کہ ہمیں اس دین پر عمل کرنا ہے جو ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا ہے۔ اس کو جاننے کا ذریعہ صرف قرآن وسنت ہیں۔ جن امور کو قرآن وسنت سے اخذ نہیں کیا گیا، وہ مردود ہیں۔ ہر مسلمان کو یہ طے کرنا لازم ہے کہ جس چیز کو وہ دین سمجھ رہا ہے، وہ قرآن وسنت سے لیا گیا ہے یا نہیں۔

قرآنیات

البیان

جاوید احمد غامدی

مرحلۂ ہجرت و براءت

الزمر - الاحقاف

۳۹ — ۴۶

الزمر - المؤمن

۳۹ —— ۴۰

الزمر - المؤمن

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ دونوں میں انذار و بشارت کے ساتھ توحید پر ایمان کی دعوت دی گئی ہے۔ پہلی سورہ میں، البتہ اثبات اور دوسری میں منکرین کے لیے تنبیہ و انذار اور اہل ایمان کے لیے تسلی، تشویق اور حوصلہ افزائی کا پہلو نمایاں ہے۔ اِسی طرح جو لوگ ابھی تذبذب میں تھے، اُنھیں بھی رہنمائی دی گئی ہے کہ مصلحتوں سے بے پروا ہو کر وہ بھی آگے بڑھیں اور دعوت حق کی اِس جدوجہد میں پیغمبر کے ساتھی بن جائیں۔ دونوں کی ابتدا الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ ایک ہی آیت سے ہوئی ہے۔ اِس سے خود قرآن نے اِن کے اِس تعلق کی طرف اشارہ کر دیا ہے اور الفاظ کے اِس فرق سے یہ بات بھی واضح کر دی ہے کہ پہلی سورہ میں خدا کی حکمت اور دوسری میں اُس کا علم بنائے استدلال ہے۔

اِن سورتوں سے آگے مزید چھ سورتوں کے مطالب بھی کم و بیش وہی ہیں جو اوپر سورۂ 'المؤمن' کے بیان ہوئے ہیں۔ چنانچہ اِن کا نام بھی اللہ تعالیٰ نے ایک ہی، یعنی 'حٰم' رکھا ہے اور اِسی بنا پر یہ حوامیم کہلاتی ہیں۔

دونوں سورتوں کے مخاطب قریش ہیں اور اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ ام القریٰ مکہ میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ ہجرت و براءت میں نازل ہوئی ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورة الزمر

(۱)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تَنۡزِیۡلُ الۡکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَکِیۡمِ ۝۱ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ
بِالۡحَقِّ فَاعۡبُدِ اللّٰہَ مُخۡلِصًا لَّہُ الدِّیۡنَ ۝۲ اَلَا لِلّٰہِ الدِّیۡنُ الۡخَالِصُ ؕ وَالَّذِیۡنَ

۱

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ کتاب اللہ کی طرف سے اتاری گئی ہے، نہایت اہتمام کے ساتھ، جو زبردست ہے، بڑی حکمت والا ہے۔[۱] ہم نے، (اے پیغمبر)، اِس کتاب کو تمھاری طرف قول فیصل کے ساتھ اتارا

۱۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی اور قرآن کے مکذبین کے لیے تہدید و وعید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس خدا نے یہ کتاب اتاری ہے، اُس کے ارادوں میں کوئی مزاحم نہیں ہو سکتا۔ وہ اگر لوگوں کو ڈھیل دے رہا ہے تو یہ اُس کی حکمت کا تقاضا ہے اور ڈھیل کے اِس عرصے میں اگر کچھ مزاحمتیں اِس کتاب کے منکرین کی طرف سے پیش آ رہی ہیں تو اُنھیں بھی اِسی حکمت پر محمول کرنا چاہیے۔ اِس لیے یہ منکرین بھی متنبہ ہوں اور آپ بھی مطمئن رہیے، اُس کا فیصلہ صادر ہو جائے گا تو کوئی اُسے ٹالنے والا نہیں ہو گا۔

اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِيَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ
بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۵ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ﴿۳﴾
لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۙ سُبْحٰنَهٗ ۭ هُوَ
اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۴﴾

ہے۔[۲] سو اللہ ہی کی بندگی کرو، اپنی اطاعت کو اُسی کے لیے خالص کرتے ہوئے۔[۳] سنو، خالص اطاعت اللہ ہی کے لیے ہے۔[۴] اللہ کے سوا جن لوگوں نے دوسرے کارساز بنا رکھے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہم تو اُن کی عبادت صرف اِس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہم کو اللہ سے قریب تر کر دیں،[۵] اللہ یقیناً اُن کے درمیان اُس بات کا فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔ بے شک، اللہ اُن لوگوں کو راہ یاب نہیں کرتا[۶] جو جھوٹے اور ناشکرے ہیں۔[۷] ۱-۳

(یہ احمق سوچتے نہیں کہ) اگر اللہ چاہتا کہ کسی کو اولاد بنائے تو اپنی مخلوقات میں سے جو چاہتا، (اپنے لیے) خود منتخب کر لیتا۔[۸] (مگر) وہ اِس سے پاک ہے۔ وہ اکیلا خدا ہے، سب پر قابو رکھنے والا۔ ۴

۲۔ یعنی شرک اور توحید کے باب میں جو اختلافات پیدا کر دیے گئے ہیں، اُن کے لیے قول فیصل کے ساتھ اتارا ہے۔

۳۔ یعنی اِس طرح کہ پرستش بھی اُسی کی ہو اور کسی قید و شرط کے بغیر حکم بھی اُسی کا مانا جائے۔

۴۔ یعنی ایسی بے آمیز اطاعت جس میں نفس اور غیر، دونوں کی طرف سے کسی شرکت کا شائبہ نہ ہو۔

۵۔ دنیا بھر کے مشرکین اپنے شرک کے لیے بالعموم یہی استدلال کرتے ہیں۔

۶۔ مطلب یہ ہے کہ نہ دنیا میں ہدایت دیتا ہے اور نہ آخرت میں منزل مراد تک پہنچاتا ہے۔

۷۔ یعنی اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں کہ اُس نے فلاں اور فلاں کو اپنا شریک بنایا ہے اور سب نعمتیں اُسی سے پاتے ہیں، لیکن دوسروں کی حمد و ثنا میں رطب اللسان رہتے ہیں۔

۸۔ یعنی تمھارا انتظار نہ کرتا کہ تم اپنی طرف سے اُس کے لیے بیٹے اور بیٹیاں تصنیف کرو، بلکہ خود فیصلہ کرتا اور اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے اعلان کر دیتا کہ فلاں اور فلاں کو اُس نے اپنا بیٹا یا بیٹی بنایا ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ ۚ یُکَوِّرُ الَّیۡلَ عَلَی النَّهَارِ وَیُکَوِّرُ
النَّهَارَ عَلَی الَّیۡلِ وَسَخَّرَ الشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ ؕ کُلٌّ یَّجۡرِیۡ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ
اَلَا هُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡغَفَّارُ ﴿۵﴾

خَلَقَکُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَۃٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا وَاَنۡزَلَ لَکُمۡ مِّنَ
الۡاَنۡعَامِ ثَمٰنِیَۃَ اَزۡوَاجٍ ؕ یَخۡلُقُکُمۡ فِیۡ بُطُوۡنِ اُمَّهٰتِکُمۡ خَلۡقًا مِّنۡۢ بَعۡدِ

زمین اور آسمانوں کو اُس نے مقصد سے پیدا کیا ہے۔[9] وہ رات کو دن پر لپیٹتا ہے اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے اور سورج اور چاند کو اُسی نے مسخر کر رکھا ہے۔ ہر ایک وقت مقرر کے لیے چلا جا رہا ہے۔[10] سنو، وہی زبردست ہے، بڑا ہی بخشنے والا ہے۔[11] ۵

اُسی نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا، پھر اُسی کی جنس سے اُس کا جوڑا بنایا اور تمھارے لیے چوپایوں کی آٹھ قسمیں[12] اتاریں،[13] نر و مادہ۔ (اِس لیے کہ اُن سے اپنی معیشت کی ضرورتیں پوری

۹۔ لہٰذا یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ تمھارے مشرکانہ اوہام کے مطابق اپنے انجام کو پہنچیں اور اِس کے نتیجے میں حق و باطل میں سرے سے کوئی امتیاز ہی باقی نہ رہے۔

۱۰۔ مطلب یہ ہے کہ اُس نے صرف بنایا ہی نہیں، اپنی مخلوقات کا نظم بھی اپنے ہی ہاتھ میں رکھا ہے۔ کسی کا یارا نہیں ہے کہ اُس میں کسی نوعیت کی کوئی مداخلت کر سکے۔ چنانچہ سورج، چاند اور دوسرے سیاروں اور ستاروں کے لیے جو منزل مقرر کر دی گئی ہے، ہر ایک وقت مقرر کی پابندی کے ساتھ اُسی کے لیے چلا جا رہا ہے، کوئی اُسے اپنی راہ سے بے راہ نہیں کر سکتا۔

۱۱۔ یعنی کوئی نہ اُس پر غلبہ پا کر اُس کے ارادوں میں مزاحم ہو سکتا ہے اور نہ اپنی طرف سے کسی کو بخشش کی امید دلا سکتا ہے۔ اُس کے بندے اگر مغفرت کا حق پیدا کر لیں تو وہ خود سب سے بڑھ کر بخشنے اور درگذر فرمانے والا ہے۔

۱۲۔ اصل میں 'ثَمٰنِیَۃَ اَزۡوَاجٍ' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ 'زَوۡج' کا لفظ جوڑے کے لیے بھی آتا ہے اور جوڑے کے ایک فرد کے لیے بھی۔ یہاں یہ اِسی دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے اور اِس سے بھیڑ، بکری،

خَلۡقٍ فِیۡ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ؕ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمۡ لَہُ الۡمُلۡکُ ؕ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۚ
فَاَنّٰی تُصۡرَفُوۡنَ ﴿۶﴾

اِنۡ تَکۡفُرُوۡا فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنۡکُمۡ ۟ قف وَلَا یَرۡضٰی لِعِبَادِہِ الۡکُفۡرَ ۚ وَاِنۡ
تَشۡکُرُوۡا یَرۡضَہُ لَکُمۡ ؕ وَلَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی ؕ ثُمَّ اِلٰی رَبِّکُمۡ مَّرۡجِعُکُمۡ

کرو)۔ تمھاری ماؤں کے پیٹ میں وہ ایک کے بعد دوسری خلقت میں[14] تمھیں تین اندھیروں کے اندر[15] پیدا کرتا ہے۔ وہی اللہ تمھارا پروردگار ہے۔ اُسی کی بادشاہی ہے۔ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ پھر کہاں بھٹکا دیے جاتے ہو![16] ۶

اگر تم ناشکری کرو گے[17] تو اللہ کا کچھ نہیں بگاڑو گے، اِس لیے کہ اللہ تم سے بے نیاز ہے۔ ہاں، وہ اپنے بندوں کے لیے ناشکری کو پسند نہیں کرتا۔ اور اگر شکر گزار ہو گے تو اُس کو وہ تمھارے لیے پسند کرے گا۔[18] (یاد رکھو، قیامت کے دن) کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں

اونٹ اور گاے کے نر و مادہ مراد ہیں۔ عرب میں یہی چوپایے معروف تھے۔

۱۳۔ آیت میں چوپایوں کے لیے 'اَنۡزَلَ لَکُمۡ' کے الفاظ بالکل اُسی طرح آئے ہیں، جس طرح لوہے کے لیے دوسری جگہ فرمایا ہے کہ 'وَاَنۡزَلۡنَا الۡحَدِیۡدَ'۔ اِس سے مقصود لوگوں کو ہر چیز کے منبع کی طرف توجہ دلانا ہے۔

۱۴۔ یعنی نطفہ، علقہ وغیرہ جن کا ذکر دوسرے مقامات میں تفصیل کے ساتھ ہوا ہے۔

۱۵۔ یہ پیٹ، رحم اور مشیمہ (وہ جھلی جس میں بچہ لپٹا ہوا ہوتا ہے) کے تہ بر تہ اندھیروں کی طرف اشارہ ہے۔

۱۶۔ اصل میں لفظ 'تُصۡرَفُوۡنَ' استعمال ہوا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"... 'تُصۡرَفُوۡنَ' مجہول کا صیغہ اِس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اِن واضح حقائق فطرت کے بعد کسی غلط سمت میں بھٹکنے کی گنجایش تو نہیں تھی، لیکن تم نے، معلوم نہیں، کس شیطان کے ہاتھ میں اپنی باگ پکڑا دی ہے جو تمھیں گم راہی کی وادیوں میں گردش کرا رہا ہے؟" (تدبر قرآن ۶/۵۶۶)

۱۷۔ یعنی اِس کے باوجود ناشکری کرو گے کہ خود بھی جانتے ہو کہ تمھاری پیدایش اور پرورش میں خدا کے سوا کسی اور کو کوئی دخل نہیں ہے۔

۱۸۔ اور اِس کے نتیجے میں دنیا اور آخرت، دونوں میں اپنی نعمتوں اور برکتوں سے تمھیں نوازے گا۔

فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴿۷﴾
وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِيْبًا اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ
نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُوْۤا اِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ وَجَعَلَ لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ
قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيْلًا ۖۗ اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ﴿۸﴾
اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا
رَحْمَةَ رَبِّهٖ ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ؕ

اٹھائے گا۔ پھر تمھاری واپسی تمھارے پروردگار ہی کی طرف ہو گی،[19] تو جو کچھ تم کرتے رہے ہو، وہ تمھیں بتادے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تو دلوں کے بھید تک جانتا ہے۔ ۷

انسان (کا معاملہ بھی عجیب ہے کہ اُس) کو جب کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہو کر اُس کو پکارتا ہے۔ پھر جب اُس کا پروردگار اپنی طرف سے اُس کو فضل عطا فرماتا ہے تو پہلے جس چیز کے لیے پکار رہا تھا، اُس کو بھول جاتا ہے اور اللہ کے شریک ٹھیرانے لگتا ہے کہ اُس کی راہ سے لوگوں کو گم راہ کرے۔[20] اِس سے کہو، (اے پیغمبر) کہ تھوڑے دن اپنے اِس کفر کے ساتھ بہرہ مند ہو لو، اِس میں شبہ نہیں کہ بالآخر تم دوزخ والوں میں ہو گے۔ ۸

(لوگو)، کیا وہ جو رات کی گھڑیوں[21] میں (اپنے پروردگار کے آگے) کبھی سجدے اور کبھی قیام میں عاجزی کرنے والے ہیں، آخرت سے اندیشہ ناک اور اپنے پروردگار کی رحمت کے امیدوار ہیں[22] اور جو اپنے شریکوں کے سہارے پر اُس کو بھلائے ہوئے ہیں، برابر ہو جائیں گے؟[23] اِن سے

۱۹۔ یعنی پروردگار ہی کی طرف ہو گی، تمھارے مزعومہ دیوی دیوتاؤں کی طرف نہیں ہو گی۔

۲۰۔ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ یہاں قریش کے ائمۂ کفر کا معاملہ زیر بحث ہے جو خدا کی راہ سے خود بھی برگشتہ تھے اور دوسروں کو بھی اُس سے برگشتہ کرتے تھے۔

۲۱۔ یعنی اُس وقت، جب کوئی نہیں دیکھتا اور بندے کی عبادت ریا کے ہر شائبے سے پاک ہوتی ہے۔

۲۲۔ یہ اُن کی نماز کے باطن کا بیان ہے جو نرم بستروں سے اٹھا کر اُنھیں خدا کے حضور میں کھڑا کر دیتا ہے۔

اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿٩﴾

قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا

حَسَنَةٌ ؕ وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ؕ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿١٠﴾

پوچھو، کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے کبھی یکساں ہو سکتے ہیں؟[۲۴] حقیقت یہ ہے کہ (اِن سب باتوں سے) یاددہانی تو عقل والے ہی حاصل کرتے ہیں۔[۲۵] ۹

(انھیں اب اِن کے حال پر چھوڑو، اے پیغمبر، اور میرے بندوں سے) کہہ دو کہ میرے بندو جو ایمان لائے ہو، تم اپنے رب سے ڈرتے رہو (اور یاد رکھو کہ) جو لوگ اِس دنیا میں بھلائی اختیار کریں گے، اُن کے لیے آخرت میں بھلائی ہے۔ (تمھارے وطن کی زمین اگر تمھارے لیے تنگ کر دی گئی ہے تو مایوس نہ ہو)، خدا کی زمین وسیع ہے، (وہ اُس کی راہیں تمھارے لیے کھول

۲۳۔ جملے کا یہ حصہ اصل میں محذوف ہے جو متکلم کے زور بیان سے واضح ہو رہا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"... یہ اسلوب متکلم کی شدت یقین پر بھی دلیل ہوتا ہے اور اِس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اِس سوال کے جواب میں مخاطب کے لیے کسی اختلاف کی گنجایش نہیں ہے۔ مزید برآں بات کا ایک حصہ بغیر اظہار کے ظاہر ہو جاتا ہے۔" (تدبر قرآن ۶/ ۵۷۰)

۲۴۔ اِس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ قرآن کے نزدیک اہل علم وہی ہیں جن کے اوصاف اوپر بیان ہوئے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"... جن کے اندر یہ صفت موجود نہیں ہے، وہ قرآن کے نزدیک علم سے عاری ہیں، اگرچہ وہ چاند اور مریخ تک سفر کر آئیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ زندگی کی رہنمائی کے لیے اصلی علم یہ ہے کہ انسان کو یہ پتا ہو کہ یہ دنیا کہاں سے آئی ہے، کہاں منتہی ہو گی، اِس کے خالق کی صفات کیا ہیں اور اُس کے ساتھ انسان کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ اگر اِس علم کی کلید اُس کے ہاتھ آ گئی تو وہ اپنی زندگی کا مقصد و منتہا سمجھ جائے گا۔ اور اگر یہ علم حاصل نہ ہو سکا تو وہ اندھیرے میں ہے، اگرچہ وہ آسمان و زمین کا طول و عرض ناپ ڈالے۔" (تدبر قرآن ۶/ ۵۷۲)

۲۵۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ یہ نہیں مان رہے تو اِس میں آپ کا یا قرآن کا کوئی قصور نہیں ہے، بلکہ یہ لوگ ہی علم و عقل سے عاری ہیں۔

قُلۡ اِنِّیۡۤ اُمِرۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ اللّٰہَ مُخۡلِصًا لَّہُ الدِّیۡنَ ﴿۱۱﴾ وَ اُمِرۡتُ لِاَنۡ اَکُوۡنَ
اَوَّلَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ﴿۱۲﴾ قُلۡ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اِنۡ عَصَیۡتُ رَبِّیۡ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ﴿۱۳﴾
قُلِ اللّٰہَ اَعۡبُدُ مُخۡلِصًا لَّہٗ دِیۡنِیۡ ﴿۱۴﴾ فَاعۡبُدُوۡا مَا شِئۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِہٖ ؕ قُلۡ
اِنَّ الۡخٰسِرِیۡنَ الَّذِیۡنَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ وَ اَہۡلِیۡہِمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ؕ اَلَا ذٰلِکَ ہُوَ
الۡخُسۡرَانُ الۡمُبِیۡنُ ﴿۱۵﴾ لَہُمۡ مِّنۡ فَوۡقِہِمۡ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَ مِنۡ تَحۡتِہِمۡ ظُلَلٌ ؕ
ذٰلِکَ یُخَوِّفُ اللّٰہُ بِہٖ عِبَادَہٗ ؕ یٰعِبَادِ فَاتَّقُوۡنِ ﴿۱۶﴾
وَ الَّذِیۡنَ اجۡتَنَبُوا الطَّاغُوۡتَ اَنۡ یَّعۡبُدُوۡہَا وَ اَنَابُوۡۤا اِلَی اللّٰہِ لَہُمُ الۡبُشۡرٰی ۚ

دے گا اور اُس کے) جو (بندے اِن آزمایشوں میں) ثابت قدم رہیں گے، اُنھی کے لیے اُن کا صلہ بے حساب پورا کیا جائے گا۔ ۱۰

کہہ دو کہ مجھے تو حکم ملا ہے کہ میں اللہ ہی کی بندگی کروں، اپنی اطاعت کو اُسی کے لیے خالص کرتے ہوئے اور حکم ملا ہے کہ میں سب سے پہلا مسلمان بنوں۔[۲۶] کہہ دو کہ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ایک بڑے ہول ناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ ۱۱-۱۳

کہہ دو کہ میں تو اللہ ہی کی بندگی کرتا ہوں، اپنی اطاعت کو اُسی کے لیے خالص کرتے ہوئے۔ رہے تم تو اُس کے سوا جس کی بندگی چاہو، کرو، (میں اُس سے بری ہوں)۔ کہہ دو کہ خسارے میں تو در حقیقت وہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو قیامت کے دن خسارے میں ڈال دیا۔ سنو، یہی کھلا ہوا خسارہ ہے۔ اُن کے لیے اُن کے اوپر سے بھی آگ کے سائبان ہوں گے اور اُن کے نیچے سے بھی۔ یہی چیز ہے جس سے اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے۔ میرے بندو، اِس لیے مجھ سے ڈرو۔ ۱۴-۱۶

اِس کے بر خلاف جو شیطان[۲۷] سے بچے کہ اُس کی بندگی کریں اور اللہ کی طرف متوجہ رہے،

۲۶۔ یعنی جس چیز کی دعوت دوسروں کو دیتا ہوں، سب سے پہلے خود اُس کو قبول کروں۔

۲۷۔ اصل میں لفظ 'الطَّاغُوۡت' آیا ہے۔ اپنے مصداق کے لحاظ سے یہ واحد، جمع، مذکر، مونث، سب

فَبَشِّرْ عِبَادِ ﴿۱۷﴾ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ
هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۱۸﴾
اَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ اَفَاَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ ﴿۱۹﴾ لٰكِنِ
الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرَفٌ مِّنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ وَعْدَ اللّٰهِ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِيْعَادَ ﴿۲۰﴾

اُن کے لیے خوش خبری ہے۔ سو میرے اِن بندوں کو خوش خبری دو، یہ جو بات کو توجہ سے سنتے، پھر اُس کے بہتر کی پیروی کرتے ہیں۔ یہی ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی اور یہی ہیں جو عقل والے ہیں۔ ۱۷-۱۸

پھر کیا جس پر عذاب کی بات پوری ہو چکی[۲۸] اور جس کا ٹھکانا اب دوزخ ہی ہے تو کیا تم اُس کو بچاؤ گے جو دوزخ میں پڑا ہے؟ البتہ جو اپنے پروردگار سے ڈرتے رہے، اُن کے لیے بالاخانے اور بالاخانوں کے اوپر بھی آراستہ[۲۹] بالاخانے ہیں۔ اُن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی۔ یہ اللہ کا حتمی وعدہ ہے۔ اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہ کرے گا۔ ۱۹-۲۰

کے لیے آجاتا ہے اور اِس کے لیے ضمیریں بھی اِسی رعایت سے استعمال ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ یہاں مونث کی ضمیر ہے، جب کہ سورۂ نساء (۴) کی آیت ۶۰ میں ضمیر مذکر استعمال ہوئی ہے۔

۲۸۔ یعنی اپنے کرتوتوں کی پاداش میں جو عذاب کا مستحق ہو چکا ہے۔

۲۹۔ اصل میں لفظ 'مَبْنِيَّة' استعمال ہوا ہے۔ عربی زبان میں 'بنی الدار' جس طرح مکان بنانے کے مفہوم میں آتا ہے، اُسی طرح مکان آراستہ کرنے کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ یہ اُسی سے اسم مفعول ہے۔

[باقی]

حدیث سیل

ترجمہ وتدوین: شاہد رضا

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد مسلم حکومتیں

عَنْ حُذَيْفَةَ بْنِ الْيَمَانِ يَقُولُ: يَا أَيُّهَا النَّاسُ، أَلَا تَسْأَلُونِي فَإِنَّ النَّاسَ كَانُوا يَسْأَلُونَ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْخَيْرِ وَكُنْتُ أَسْأَلُهُ عَنِ الشَّرِّ، إِنَّ اللهَ بَعَثَ نَبِيَّهُ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ فَدَعَا النَّاسَ مِنَ الْكُفْرِ إِلَى الْإِيمَانِ وَمِنَ الضَّلَالَةِ إِلَى الْهُدَى فَاسْتَجَابَ مَنِ اسْتَجَابَ فَحَيَّ مِنْ الْحَقِّ مَا كَانَ مَيْتًا وَمَاتَ مِنْ الْبَاطِلِ مَا كَانَ حَيًّا، ثُمَّ ذَهَبَتِ النُّبُوَّةُ فَكَانَتِ الْخِلَافَةُ عَلَى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ.

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ اے لوگو، تم مجھ سے چیزوں کے بارے میں کیوں نہیں پوچھتے؟ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اچھی باتوں کے بارے میں سوال کرتے تھے، جب کہ میں آپ سے برائی کے بارے میں پوچھتا تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث کیا تھا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو کفر سے نکال کر ایمان کی طرف اور گم راہی سے نکال کر ہدایت کی طرف بلایا۔ جنھوں نے آپ کی پکار پر لبیک کہا، انھوں نے لبیک کہا اور اس طرح جو لوگ باطل کے اندھیروں میں مر چکے تھے، ان کو

حق کے ساتھ نئی زندگی دی گئی اور جو زندہ تھے، ان کو باطل کی وجہ سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ پھر اس کے بعد نبوت ختم ہو گئی اور پھر نبوت کی طرز پر حکومت قائم ہو گئی۔

متون

یہ روایت احمد، رقم ۲۳۴۷۹ میں حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی ہے۔

احمد، رقم ۱۸۴۳۰ میں یہ روایت قدرے مختلف الفاظ میں روایت کی گئی ہے۔ اس کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

تكون النبوة فيكم ما شاء الله أن تكون، ثم يرفعها إذا شاء أن يرفعها، ثم تكون خلافة على منهاج النبوة فتكون ما شاء الله أن تكون، ثم يرفعها إذا شاء الله أن يرفعها، ثم تكون ملكًا عاضًا فيكون ما شاء الله أن يكون، ثم يرفعها إذا شاء أن يرفعها، ثم تكون ملكًا جبرية فتكون ما شاء الله أن تكون، ثم يرفعها إذا شاء أن يرفعها، ثم تكون خلافة على منهاج النبوة، ثم سكت.

”نبوت تم میں اس وقت تک باقی رہے گی جب تک اللہ تعالیٰ اس کو باقی رکھنے کا فیصلہ کرے گا، پھر جب اللہ اسے ختم کرنے کا فیصلہ کرے گا تو اسے ختم کر دے گا۔ پھر نبوت کے بعد نبوت کی طرز پر ایک حکومت ہو گی اور وہ اس وقت تک موجود رہے گی جب تک خدا اس کے وجود کا فیصلہ کرے گا، پھر جب اسے ختم کرنے کا فیصلہ کرے گا تو اسے ختم کر دے گا۔ پھر ایک سلطنت ہو گی، جس میں لوگوں کو آزمایشوں اور فتنوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور وہ اس وقت تک قائم رہے گی جب تک خدا اس کے وجود کا فیصلہ کرے گا، پھر وہ اسے ہٹا دے گا، جب وہ اسے ہٹانے کا فیصلہ کرے گا۔ اس کے بعد ایک جابرانہ بادشاہت ہو گی اور جب تک خدا اس کے وجود کا فیصلہ کرے گا تب تک وہ قائم رہے گی، پھر وہ اسے ہٹا دے گا، جب وہ اسے ہٹانے کا فیصلہ کرے گا۔ اس کے بعد ایک بار پھر نبوت کی طرز پر

حکمرانی ہوگی۔ یہ کہہ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔“

یہ روایت حذیفہ بن الیمان، النعمان بن بشیر، حبیب بن سالم، داؤد بن ابراہیم الواسطی اور سلیمان بن داؤد الطیالسی کی سند سے روایت کی گئی ہے۔

بخاری اپنی کتاب ”التاریخ الکبیر“ (۳۱۸/۲) میں لکھتے ہیں کہ ’فيه النظر‘، یعنی انھیں حبیب بن سالم کی روایات پر کچھ تحفظات ہیں۔ ابو احمد بن عدی کہتے ہیں کہ حبیب بن سالم کی روایات کے متن میں کوئی مسئلہ نہیں ہے، البتہ وہ جن راویوں کے ذریعے سے روایت کرتے ہیں، ان کے سلسلۂ سند کو خلط ملط کر دیتے ہیں۔ ماہرین کے ایسے تبصروں کے پیش نظر اس روایت کی صداقت کے بارے میں قطعی طور پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔

بیہقی، رقم ۱۶۴۰۷ میں یہ روایت قدرے مختلف الفاظ میں روایت کی گئی ہے۔ اس روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

إن الله بدأ هذا الأمر نبوة ورحمة وكائنًا خلافة ورحمة وكائنًا ملكًا عضوضًا وكائنًا عتوة وجبرية وفسادًا في الأمة يستحلون الفروج والخمور والحرير وينصرون على ذالك ويرزقون أبدًا حتى يلقوا الله عز وجل.

”خدا نے (تمھارے) اس نظم کا آغاز نبوت اور اپنی عظیم رحمت سے کیا۔ پھر اس کے بعد ایک عظیم حکمرانی اور بڑی رحمت ہوگی۔ پھر ایک سلطنت ہوگی جس میں لوگ آزمایشوں اور فتنوں کا شکار ہوں گے۔ پھر مسلمانوں میں ایک جابرانہ بادشاہت اور ایک بڑا فساد برپا ہو جائے گا، لوگ بد اخلاقی، نشہ اور ریشم، (یعنی عیاشی) میں غرق ہو جائیں گے۔ بہر حال ان کی اس حالت میں بھی ان کی مدد کی جائے گی اور ان کو اللہ تعالیٰ سے ملنے تک ہمیشہ رزق مہیا کیا جائے گا۔“

یہ روایت ابو عبیدہ بن الجراح اور معاذ بن جبل، ابو ثعلبہ الخشنی، عبد الرحمٰن بن سابط، لیث بن ابو سَلیم یا سُلیم، جریر ابن حازم، ابو داؤد اور یونس بن حَبیب یا حُبیب، عبد اللہ ابن جعفر اور ابو بکر ابن فورک کی سند سے مروی ہے۔ ان راویوں میں لیث بن ابو سلیم پر اس کی کم زور یادداشت کی وجہ سے سخت تنقید کی گئی ہے، اس لیے کہ وہ

روایات کو خلط ملط کر دیتا تھا۔ اس کی کم زور یادداشت کے پیش نظر لیث کی روایتیں عام طور پر قابل قبول نہیں ہوتیں۔

ابویعلیٰ، رقم ۸۷۳ میں انھی الفاظ میں روایت کی گئی ہے۔ تاہم اسی طرح کی سند سے روایت ہونے کی وجہ سے اس میں اسی طرح کا ضعف پایا جاتا ہے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے۔

سنن الدارمی، رقم ۲۱۰۱ میں یہ روایت قدرے مختلف الفاظ میں مروی ہوئی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

أول دينكم نبوة ورحمة، ثم ملك ورحمة، ثم ملك أعفر، ثم ملك وجبروت يستحل فيها الخمر والحرير.	”تمھارے دین کی ابتدا نبوت اور رحمت سے ہوئی، پھر ایک بے کار بادشاہی ہوگی، پھر ایک جابرانہ بادشاہت ہوگی، جس میں لوگ نشہ اور ریشم، (یعنی شاہانہ زندگی) کو اپنے لیے حلال کرلیں گے۔“

یہ روایت ابوثعلبہ الخشنی سے مکحول کے ذریعے سے منقول ہوئی ہے۔ تاہم راویوں کی زندگی کے ماہرین کا خیال ہے کہ مکحول نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر ان اصحاب سے ملاقات نہیں کی تھی جن سے اس نے اپنی روایتیں منسوب کی ہیں۔ کتاب ”جامع التحصیل“ (۲۸۵/۱) میں خاص طور پر یہ بیان ہوا ہے کہ غالباً مکحول نے اپنی روایت ابوثعلبہ الخشنی سے براہ راست سننے کے بغیر منسوب کی ہے۔ اس روایت کے سلسلۂ سند میں اس انقطاع کے پیش نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس کی نسبت ناقابل اعتبار ہو جاتی ہے۔

ترمذی، رقم ۲۲۲۶ میں روایت ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

الخلافة في أمتي ثلاثون سنة، ثم ملك بعد ذالك.	”میری امت میں تیس سال تک ایک اچھی حکومت رہے گی۔ پھر اس کے بعد بادشاہت ہوگی۔“

اس روایت کو درج کرنے کے بعد ترمذی نے خود اسے ’حسن‘ قرار دیا ہے، جو کہ صحیح کے درجے سے کم ہے۔ ترمذی نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ روایت صرف سعید بن جمحان سے مروی ہے۔ سعید بن جمحان کے بارے میں فن رواۃ کے علما میں ملی جلی رائے پائی جاتی ہے۔ بعض اسے قابل اعتبار سمجھتے ہیں، جب کہ بعض نہیں سمجھتے (دیکھیے: المحلیٰ ۱۸۵/۹۔ مجمع الزوائد ۱۰/ ۲/ ۱۷۱۔ عون المعبود ۱۰/ ۱۶۳۔ الکاشف ۱/ ۴۳۳ اور میزان الاعتدال ۳/ ۱۹۳)۔ سعید بن جمحان سے مروی یہ روایت بعض اختلافات کے ساتھ ابن حبان، رقم ۶۶۵۷، ۶۹۴۳؛ ابوداؤد، رقم

۴۶۴۶، ۴۶۴۷؛ نسائی، السنن الکبریٰ، رقم ۸۱۵۵ اور احمد، رقم ۲۱۹۶۹، ۲۱۹۷۳ اور ۲۱۹۷۸ میں بھی روایت کی گئی ہے۔

ابوداؤد، رقم ۴۶۳۵ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ:

خلافة نبوة، ثم يؤتي الله الملك من يشاء.

”ایک پیغمبرانہ حکمرانی ہو گی اور پھر خدا جسے چاہے گا، حکمرانی عطا فرمائے گا۔“

یہ روایت احمد، رقم ۲۰۴۶۳، ۲۰۵۲۲، ۲۰۵۲۴ اور مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۰۴۸۲ میں بھی روایت کی گئی ہے۔

یہ روایت ایک ایسے سلسلۂ سند کے ذریعے سے نقل کی گئی ہے جس میں علی ابن زید ابن جدعان بھی شامل ہیں۔ علی ابن زید کو ایک ضعیف راوی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جھوٹے اقوال کی نسبت کرنے والا سمجھا جاتا ہے۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب روایات کی سند کو تبدیل کرنے کا بھی الزام لگایا جاتا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: الضعفاء الکبیر ۳/۲۲۹ اور تذکرۃ الحفاظ ۱/۱۴۰۔

مذکورہ بالا تجزیے سے واضح ہوتا ہے کہ اس روایت کے راویوں کی کوئی ایک قابل اعتماد سند بھی موجود نہیں ہے، جس کے ذریعے سے اس روایت کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کر سکیں۔ اس حقیقت کے پیش نظر اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول قرار دینا درست معلوم نہیں ہوتا۔

ساجد حمید

’لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ‘؟

(۴)

روایت ابن عباس کا جائزہ

اب ہم اس مضمون میں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منسوب اس روایت کا جائزہ لیں گے۔ لازم ہے کہ حضرت ابن عباس کا مختصر سا تعارف ہو جائے۔ حضرت ابن عباس، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس کے صاحب زادے ہیں۔ آپ کی ولادت ۳ برس قبل ہجرت ہوئی۔ آپ کے والد حضرت عباس ۸ ہجری میں ایمان سے مشرف ہوئے، اور ہجرت کر کے مدینہ پہنچے۔ ۸ ہجری سے پہلے وہ مکہ ہی میں اپنے والد حضرت عباس کے ساتھ رہے۔ بس آپ کو صحبت نبوی انھی ڈیڑھ دو برسوں میں حاصل رہی۔ آپ کی خالہ سیدہ میمونہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں شامل ہیں۔

اس روایت کا جائزہ ہم اسی اصول پر لیں گے جس اصول پر پہلے بھی راویوں کے تصرفات پر چند مضامین لکھے ہیں۔ آیئے، کسی ایک متن سے اس بحث کا آغاز کرتے ہیں:

عَنْ سَعِيدِ بْنِ جُبَيْرٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، فِي قَوْلِهِ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ﴾. قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا نَزَلَ عَلَيْهِ جِبْرِيلُ بِالْوَحْيِ كَانَ مِمَّا

”سعید بن جبیر قرآن کی آیت ’لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ‘ کے بارے میں ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ جب وحی نازل ہوتی تو ان چیزوں میں سے جس کی وجہ سے آپ اپنی زبان اور ہونٹ

يُحَرِّكُ بِهِ لِسَانَهُ وَشَفَتَيْهِ فَيَشْتَدُّ عَلَيْهِ، فَكَانَ ذَلِكَ يُعْرَفُ مِنْهُ، فَأَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالىٰ: ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ﴾ أَخْذَهُ ﴿إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ﴾ إِنَّ عَلَيْنَا أَنْ نَجْمَعَهُ فِي صَدْرِكَ وَقُرْآنَهُ فَتَقْرَؤُهُ ﴿فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ﴾ قَالَ: أَنْزَلْنَاهُ فَاسْتَمِعْ لَهُ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ أَنْ نُبَيِّنَهُ بِلِسَانِكَ فَكَانَ إِذَا أَتَاهُ جِبْرِيلُ أَطْرَقَ فَإِذَا ذَهَبَ قَرَأَهُ كَمَا وَعَدَهُ اللّٰهُ.[21]

(مسلم، رقم ۱۴۷، ۴۴۸)

ہلاتے تھے تو وہ آپ پر گراں گزرتی، یہ گرانی آپ پر دکھائی بھی دیتی۔ تو اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری کہ قرآن اخذ کرنے کی جلدی میں زبان کو حرکت نہ دیا کیجیے، اس لیے کہ 'اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ'، یعنی یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اسے آپ کے سینے میں جمع کریں اور پڑھائیں، پھر آپ پڑھا کریں۔ 'فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ' کہا: تو جب ہم نازل کریں تو آپ اسے توجہ سے سنا کیجیے۔ اس کا بیان بھی ہمارے ذمہ ہے کہ ہم اسے آپ کی زبانی اس کا بیان کریں گے۔ پھر جب جبریل علیہ السلام آتے تو (آپ زبان کو حرکت دینے کے بجاے) سر جھکا لیتے، حضرت جبریل جب چلے جاتے تو پھر آپ پڑھتے، جیسا کہ اللہ نے آپ سے وعدہ لیا تھا۔"

اس متن میں کچھ گڑ بڑ ہے۔ مثلاً یہ جملہ 'كَانَ مِمَّا يُحَرِّكُ بِهِ لِسَانَهُ وَشَفَتَيْهِ فَيَشْتَدُّ عَلَيْهِ' نامکمل اور بے محل ہے، یعنی 'مما' کا بیان اس جملے میں موجود نہیں، یعنی ان چیزوں میں سے جن کی وجہ سے آپ زبان کو حرکت دیتے تھے.... تو وہ آپ پر گراں گزرتی؟ لیکن وہ کیا چیز تھی، بتائی نہیں گئی اور آگے بلا توقف کہہ دیا گیا ہے کہ "تو وہ آپ پر گراں گزرتی"۔ یعنی ہونا یوں چاہیے تھا کہ جس چیز کی وجہ سے آپ زبان کو حرکت دیتے، وہ یہ مشکل تھی یا وہ یہ چیز تھی۔ ایسی کوئی بات آنی چاہیے تھی، وہ نہیں آئی۔

اسی طرح 'اِنَّ عَلَيْنَا اَنْ نَجْمَعَهُ فِي صَدْرِكَ وَقُرْآنَهُ فَتَقْرَؤُهُ' اس جملے میں 'وَقُرْآنَهُ' بے محل لکھا گیا ہے، جس سے بات خراب ہو گئی ہے۔ مضمون کے مطابق بات یوں ہونی چاہیے تھی: 'اِنَّ عَلَيْنَا اَنْ نَجْمَعَهُ فِي صَدْرِكَ فَتَقْرَؤُهُ'۔ لیکن چلیے یہ ذوقی معاملہ ہو سکتا ہے، کیونکہ کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ہم قرآن کو آپ کے دل میں جمع بھی کریں اور دل ہی میں پڑھائیں گے بھی۔ تو کیا عجب کہ کوئی ایسا مان لے!

۲۱۔ اس روایت میں سورۂ قیامہ ۷۵ کی آیات بالترتیب ۱۶ سے ۱۹ ہیں۔

پھر 'فَاِذَا قَرَاۡنٰهُ فَاتَّبِعۡ قُرۡاٰنَهٗ قَالَ' میں آخری 'قال' بھی زائد ہے۔ مزید یہ کہ اس کا فاعل کون ہے؟ معلوم نہیں، اللہ تعالیٰ، ابن عباس یا کوئی اور راوی؟

بخاری کے ذیل کے متن میں یہ چیزیں درست ہیں، لیکن 'قال' کا معاملہ مزید الجھ گیا ہے۔ پوری عبارت یوں ہے: دیکھیے:

حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ أَبِي عَائِشَةَ، قَالَ: سَعِيدُ بْنُ جُبَيْرٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ فِي قَوْلِهِ تَعَالَى: ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ﴾ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعَالِجُ مِنَ التَّنْزِيلِ شِدَّةً، وَكَانَ مِمَّا يُحَرِّكُ شَفَتَيْهِ - فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: فَأَنَا أُحَرِّكُهُمَا لَكُمْ كَمَا كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحَرِّكُهُمَا، وَقَالَ سَعِيدٌ: أَنَا أُحَرِّكُهُمَا كَمَا رَأَيْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ يُحَرِّكُهُمَا، فَحَرَّكَ شَفَتَيْهِ - فَأَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالَىٰ: ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْاٰنَهُ﴾ قَالَ: جَمْعُهُ لَكَ فِي صَدْرِكَ وَتَقْرَأَهُ: ﴿فَاِذَا قَرَاۡنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهُ﴾ قَالَ: فَاسْتَمِعْ لَهُ وَأَنْصِتْ: ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ﴾ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا أَنْ تَقْرَأَهُ، فَكَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ ذَلِكَ إِذَا أَتَاهُ جِبْرِيلُ اسْتَمَعَ فَإِذَا انْطَلَقَ جِبْرِيلُ قَرَأَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَمَا قَرَأَهُ. (بخاری، رقم ۵)

"موسیٰ نے بیان کیا کہ سعید بن جبیر قرآن کی آیت 'لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ' کے بارے میں ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم وحی کی وجہ سے شدت کا سامنا کرتے تھے، یہی وجہ تھی کہ آپ ہونٹ ہلایا کرتے تھے۔ ابن عباس نے فرمایا کہ میں تم لوگوں کے لیے ویسے ہی ہلاتا ہوں، جیسے نبی کریم ہلایا کرتے تھے، سعید فرماتے ہیں کہ میں بھی ویسے ہی ہونٹ ہلا رہا ہوں جیسے ابن عباس کو ہلاتے دیکھا، تو پھر انھوں نے ہونٹ ہلائے۔ تو اس موقع پر اللہ نے یہ آیت نازل کی تھی۔ کہا کہ 'اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ' کا مطلب ہے کہ اسے آپ کے سینے میں جمع کریں گے تو آپ پڑھیں گے۔ اور 'فَاِذَا قَرَاۡنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهُ' کا مطلب ہے توجہ سے سنو اور خاموش رہو۔ اور 'ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ' کا مطلب ہے کہ پھر آپ کا پڑھنا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔ اس کے بعد پھر جب جبریل آتے تو آپ توجہ سے سنتے جب وہ چلے جاتے تو آپ اسی طرح پڑھتے جیسے آپ کو پڑھایا گیا ہوتا۔"

بخاری میں صحیح مسلم (رقم ۴۴۸) کے جملے 'كَانَ مِمَّا يُحَرِّكُ بِهِ لِسَانَهُ وَشَفَتَيْهِ فَيَشْتَدُّ عَلَيْهِ' کی جگہ بہتر عربی والا مکمل جملہ آ گیا ہے: 'كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعَالِجُ مِنَ التَّنْزِيلِ شِدَّةً، وَكَانَ مِمَّا يُحَرِّكُ شَفَتَيْهِ' (نبی کریم وحی کی وجہ سے شدت کا سامنا کرتے تھے، یہ چیز ان چیزوں میں سے تھی جن کی وجہ سے آپ ہونٹ ہلایا کرتے تھے (بخاری، رقم ۵)۔اب جس راوی کو عربی آتی ہو، وہ تو صحیح مسلم والے جملے جیسی سادہ سی غلطی نہیں کر سکتا، سوائے اس کے کہ کوئی عجمی اسے روایت کر رہا ہو، جیسے بعض علما نے اسے اس خلا کے باوجود من و عن تسلیم کر لیا۔ لیکن ایک دوسرا امکان ہے کہ بخاری کا متن روایت فراہم کرنے والوں کو مناسب نہ لگا ہو، اور انھوں نے یہ متن تبدیل کر کے صحیح مسلم والا متن فراہم کیا ہو تاکہ زبان کو حرکت دینے کا سبب وحی کی مشقت نہ رہے، بلکہ اخذ کرنا بنایا جائے۔ چنانچہ مسلم کی عبارت میں 'أخذه' کا اضافہ کر دیا گیا تاکہ اخذ کرنے کو حرکت لسانی کا سبب بنایا جائے۔ مگر شومئ تقدیر کہ متن تبدیل کرنے والے کی عربی کم زور تھی۔ مسلم کے متن میں 'أخذه' کا اضافہ یوں ہوا ہے: ('لَا تُحَرِّك بِه لِسَانَک لِتَعْجَلَ بِه أَخْذَه'، مسلم رقم ۴۴۸)، جب کہ بخاری، رقم ۵ کے متن میں یہ اضافہ نہیں ہے۔ یہ سمجھنا زیادہ مشکل نہیں کہ بخاری یا مسلم کی روایت میں رد و بدل کیا گیا ہے۔ بخاری کے متن میں عربیت کی تندرستی، اسے بہتر متن قرار دیتی ہے، اس لیے مسلم کے متن کو عربی کی خرابیوں کی وجہ سے تبدیل شدہ کہنا ممکن ہے۔ لیکن یہ ایک الگ حقیقت ہے کہ بخاری کی بیان کردہ وجہ قرآن کے خلاف ہے، اس لیے کہ قرآن واضح لفظوں میں 'لِتَعْجَلَ بِه' کہتا ہے۔ واضح رہے کہ مسلم رقم ۴۴۸ کے تحت دو متون آئے ہیں، دوسرے متن میں نہ 'أخذه' کا اضافہ ہے اور نہ پہلا جملہ تبدیل کیا گیا ہے، یعنی یہ جملہ: 'يُعَالِجُ مِنَ التَّنْزِيلِ شِدَّةً، وَكَانَ مِمَّا يُحَرِّكُ شَفَتَيْهِ'۔

مسلم رقم ۴۴۸ کے اس جملے: 'إِنَّ عَلَيْنَا أَنْ نَجْمَعَهُ فِي صَدْرِكَ وَقُرْآنَهُ فَتَقْرَؤُهُ' کی غلطی بھی بخاری رقم ۵ میں نہیں ہے اور نہ مسلم کے دوسرے متن میں ہے: 'قَالَ: جَمْعُهُ لَكَ فِي صَدْرِكَ وَتَقْرَأَهُ'۔ بخاری میں دیکھیے کہ 'صَدْرِكَ' کے بعد 'وَقُرْآنَهُ' نہیں ہے۔ یہ خطا بھی اسی عربی دان راوی کی ہے۔

'قال' کا استعمال بخاری اور مسلم، دونوں میں گڑبڑ والا ہے۔ دونوں میں مواقع استعمال میں ایک انداز نہیں ہے اور دونوں میں فاعل کو کھولا نہیں گیا۔ مواقع استعمال پر ایک انداز نہ ہونے سے میری مراد یہ ہے کہ مثلاً مسلم رقم ۴۴۸ میں آیتوں کے بعد تین جگہ پر تفسیری جملے ہیں، پہلے دو میں 'قال' تفسیری جملے سے پہلے نہیں آیا، مگر ایک میں آیا ہے:

'لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ أَخْذَهُ'، اس میں تفسیری جملہ 'قال' کے بغیر آیا ہے۔

’إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ إِنَّ عَلَيْنَا أَنْ نَجْمَعَهُ فِي صَدْرِكَ وَقُرْآنَهُ فَتَقْرَؤُهُ‘، اس میں بھی تفسیری جملہ ’قال‘ کے بغیر آیا ہے۔

’فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ قَالَ: أَنْزَلْنَاهُ فَاسْتَمِعْ لَهُ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ أَنْ نُبَيِّنَهُ بِلِسَانِكَ‘، لیکن اس میں تفسیری جملہ ’قال‘ کے بعد آیا ہے۔

بظاہر یہ ایک فطری امر ہو سکتا ہے، مگر یہ ادراجات کی نشان دہی بھی ہو سکتی ہے۔

بخاری کی روایت میں ’قال‘ کا انداز ادراج دیکھیے:

’لاَ تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ . قَالَ: جَمْعُهُ لَكَ فِي صَدْرِكَ وَتَقْرَأَهُ‘، اس میں تفسیری جملہ ’قال‘ کے بعد آیا ہے۔

’فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ قَالَ: فَاسْتَمِعْ لَهُ وَأَنْصِتْ‘، اس میں بھی تفسیری جملہ ’قال‘ کے بعد آیا ہے۔

’ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا أَنْ تَقْرَأَهُ‘، (بخاری رقم ۵)، لیکن اس میں ’قال‘ کے بغیر۔

انداز استعمال اس قدر اہم نہیں جتنی یہ بات اہم ہے کہ دونوں کتب میں یہ کمی ہے کہ دونوں میں ’قال‘ کا فاعل بیان نہیں ہوتا۔ بخاری میں قرینہ سعید بن جبیر کی طرف لے جاتا ہے، جب کہ مسلم میں حضرت ابن عباس کی طرف، لیکن کسی کا نام نہیں لیا گیا، تو ممکن ہے یہ ’قال‘ کسی راوی کے لیے بھی آگیا ہو، ابن عباس اس ’قال‘ کے قائل نہ رہے ہوں۔

لیکن ہم اگر ان اقوال کا قائل ابن عباس ہی کو لیں تو اس صورت میں ان دونوں روایتوں میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کی یہ رائے واضح ہو رہی ہے کہ حرکت لسانی کا سبب اخذ قرآن یا مشقت وحی تھا۔ اس بات کا امکان ہے کہ انھوں نے ایک ہی سبب بیان کیا ہو، مگر کسی راوی نے ایک اپنی طرف سے بڑھا دیا یا انھوں نے ہی دونوں بیان کیے ہوں، مگر بعض طرق میں ایک اور بعض میں دوسرا بیان ہو گیا ہو۔ لیکن ترمذی نے اپنی روایت میں ایک سبب کا اور اضافہ کر دیا ہے اور وہ ہے یاد کرنا:

عَنْ سَعِيدِ بْنِ جُبَيْرٍ، عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا نَزَلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ يُحَرِّكُ بِهِ لِسَانَهُ

”سعید بن جبیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ جب قرآن مجید نازل ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لیے زبان ہلایا کرتے تھے کہ

يُرِيدُ أَنْ يَحْفَظَهُ، فَأَنْزَلَ اللّٰهُ تَبارَكَ وَتَعَالىٰ: ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ﴾.

(ترمذی، رقم ۳۳۲۹۔احمد، رقم ۱۹۱۰)

اسے یاد کرلیں۔ تو تب یہ آیت اتری کہ 'لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ'۔"

بخاری میں حفظ کے پہلو ہی سے ایک اور لفظ استعمال ہوا ہے کہ آپ اس لیے زبان کو حرکت دیتے تھے کہ کہیں قرآن آپ کے ہاتھ سے نہ نکل جائے:

عَنْ مُوسَى بْنِ أَبِي عَائِشَةَ، أَنَّهُ سَأَلَ سَعِيدَ بْنَ جُبَيْرٍ، عَنْ قَوْلِهِ تَعَالىٰ: ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ﴾. قَالَ: وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: كَانَ يُحَرِّكُ شَفَتَيْهِ إِذَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ، فَقِيلَ لَهُ: ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ﴾ يَخْشَى أَنْ يَنْفَلِتَ مِنْهُ، ﴿إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ﴾، أَنْ نَجْمَعَهُ فِي صَدْرِكَ وَقُرْآنَهُ، أَنْ تَقْرَأَهُ يَقُولُ: أُنْزِلَ عَلَيْهِ: ﴿فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾ أَنْ نُبَيِّنَهُ عَلَى لِسَانِكَ. (رقم ۴۹۲۸)

"موسیٰ نے سعید بن جبیر سے 'لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ' کے بارے میں پوچھا، انھوں نے کہا کہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ آپ پر جب قرآن نازل کیا جاتا تو آپ اپنے ہونٹ ہلاتے تھے، تو فرمان آیا کہ 'لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ'۔ آپ یہ اس لیے کرتے تھے کہ کہیں قرآن ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ اس لیے کہا گیا کہ 'اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ'، یعنی ہم قرآن کو آپ کے دل میں جمع کر دیں گے اور اس کو پڑھا بھی دیں گے کہ پھر آپ پڑھیں: 'فَاِذَا قَرَاْنٰهُ' میں قرآن یہ فرما رہا ہے کہ آپ پر نازل کیا جائے گا، تو پھر آپ اس کی پیروی کریں، 'ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ' کا مطلب ہے: ہم آپ کی زبان سے تشریح فرمائیں گے[22]۔"

۲۲۔ اس روایت کے بعد امام بخاری نے ایک باب باندھا ہے، اور اس باب کے عنوان کو بھی ابن عباس سے منسوب کیا ہے: 'بَابُ قَوْلِهِ: فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: قَرَأْنَاهُ: بَيَّنَّاهُ، فَاتَّبِعْ: اعْمَلْ بِهِ'۔ اپنی کتاب "خلق افعال العباد" میں امام بخاری آیت کے اسی ٹکڑے کے بارے میں ابن عباس ہی کی یہ راے بھی نقل فرماتے ہیں: 'عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ: فَاتَّبِعْ مُجْمَلَهُ وَتَفَهَّمْ مَا فِيهِ'۔

اب سوال یہ ہے کہ حرکت زبان کے باب میں ذیل کی چار آرا میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کی اپنی رائے کیا تھی؟

۱۔ مسلم، رقم ۴۴۸ 'لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ أَخْذَهُ'، یعنی وحی کو جلد لینے کے لیے۔

۲۔ بخاری، رقم ۵، 'يُعَالِجُ مِنَ التَّنْزِيلِ شِدَّةً، وَكَانَ مِمَّا يُحَرِّكُ شَفَتَيْهِ' وحی کی مشقت سے جلدی نکلنے کے لیے۔

۳۔ ترمذی، رقم ۳۳۲۹ 'يُحَرِّكُ بِهِ لِسَانَهُ يُرِيدُ أَنْ يَحْفَظَهُ' تازہ اترنے والا قرآن حفظ کرنے کے لیے۔[23]

۴۔ بخاری، رقم ۴۹۲۸ 'يَخْشَى أَنْ يَنْفَلِتَ مِنْهُ' قرآن کے کھو جانے کے ڈر سے ایسا کرتے تھے۔

اگر اس روایت کے انتشار کو سمیٹنے کی کوشش کی جائے تو ہم پہلی اور دوسری بات کو جمع کر سکتے ہیں۔ تو اس صورت میں یہ بات بنے گی کہ چونکہ وحی کے دوران میں آپ ایک مشقت سے گزرتے تھے تو اس لیے قرآن اخذ کرنے میں جلدی کرتے تھے کہ جو وحی اس وقت اتر رہی ہے، میں اس سے جلد از جلد فارغ ہو جاؤں۔ اسی طرح ہم آخری دونوں باتوں کو بھی جمع کر سکتے ہیں کہ دونوں حفظ قرآن کی بات کر رہی ہیں، لیکن اصل میں جمع نہیں ہو سکتیں، کیونکہ قرآن ہاتھ سے جاتا رہنا صرف یاد نہ ہونے کے معنی نہیں رکھتا۔ لیکن چلیے جمع کیے لیتے ہیں۔ لہٰذا اب ان راویوں کی بات کا مطلب یہ ہوا کہ ابن عباس نے دو وجہیں بتائی ہیں جن کی وجہ سے آپ زبان مبارک کو حرکت دیا کرتے تھے: ۱۔ وحی سے ہونے والی تکلیف سے نکلنے کے لیے قرآن جلدی لینے کی کوشش۔ ۲۔ قرآن کے ضائع ہو جانے کے ڈر سے جلدی جلدی حفظ کرنے کے لیے۔

اوپر ہم آیات کے تجزیے کے دوران میں یہ بات جان چکے ہیں کہ یہ دونوں باتیں قرآن مجید کی روشنی میں ناقابل قبول ہیں۔ لہٰذا یہ روایت اپنے مندرجات کے ساتھ قرآن کی واضح تصریحات کے خلاف ہے۔ اس کے

۲۳۔ واضح رہے کہ حفظ کرنے والے متن میں ایک تصرف کی نشان دہی بخاری کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے کہ حفظ کرنے کی رائے سفیان کی تھی، جو شاید راویوں کی خطا سے بعض طرق میں ابن عباس کی بن گئی: 'عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا، قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا نَزَلَ عَلَيْهِ الوَحْيُ حَرَّكَ بِهِ لِسَانَهُ - وَوَصَفَ سُفْيَانُ - يُرِيدُ أَنْ يَحْفَظَهُ فَأَنْزَلَ اللهُ: لاَ تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ' (بخاری، رقم ۴۹۲۷)، لیکن ممکن ہے کہ یہ بھی ایک تصرف ہی ہو۔

علاوہ بھی ان روایات پر درایت کے پہلو سے مزید سوالات بھی پیدا ہوتے ہیں:

۱۔ حضرت ابن عباس، ۸ ہجری میں مدینہ تشریف لائے تو وہ گیارہ برس کے تھے۔ ہجرت کے وقت وہ صرف تین برس کے تھے۔ تو انھوں نے نبی کریم کو وحی کے دوران میں زبان ہلاتے کیسے اور کہاں دیکھا ہو گا؟ اگر کوئی کہے کہ مدینہ میں ہجرت کے بعد دیکھا، تو سوال پیدا ہو جائے گا کہ مکہ میں اللہ کے روکنے کے بعد بھی آپ مدنی دور کے آخر تک ایسا کرتے رہے؟ اسی طرح اگر ابن عباس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا تو روایات اس کی تصدیق نہیں کرتیں۔ روایات تو مشاہدہ کی بات کرتی ہیں: 'أَنَا أُحَرِّكُهُمَا لَكُمْ كَمَا كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحَرِّكُهُمَا' (بخاری، رقم ۵)۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ جس آدمی نے اس بات کی نسبت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے کی ہے، وہ ان کی ولادت، ایمان اور ہجرت کی تاریخوں سے واقف نہیں تھا۔ قرآن سے تحریک لسان کا واقعہ ایک ہی دفعہ ہونا ثابت کیا جا سکتا ہے، مگر ابن عباس سے منسوب یہ روایت اسے مسلسل عمل بتا رہی ہے، گویا آٹھ ہجری تک ایسا ہوتا رہا۔ غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم روکے جانے کے بعد بھی دس پندرہ برس یہ کام کرتے رہے (العیاذ باللہ)، جب کہ انھی ستم گر روایات میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ روکے جانے کے بعد آپ کا طرز عمل یہ تھا: 'بَعْدَ ذَلِكَ إِذَا أَتَاهُ جِبْرِيلُ اسْتَمَعَ فَإِذَا انْطَلَقَ جِبْرِيلُ قَرَأَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَمَا قَرَأَهُ' (بخاری رقم ۵) تو سوال مزید تشویش ناک ہو جاتا ہے کہ ابن عباس نے آپ کو منہ ہلاتے کیسے دیکھا۔

۲۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے وحی کی آمد گرانی کا باعث تھی، یہ بھی جیسا اوپر گزرا، قرآن کے خلاف ہے۔ لیکن فرض کیجیے کہ یہ درست ہے، تب بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن جبریل لے کر آتے تھے، اس لیے اس میں تکلیف کم ہوتی ہو گی۔ لیکن بات کو سمجھنے کے لیے بخاری کی اس روایت پر نگاہ ڈالنا فائدے سے خالی نہیں ہو گا:

عَنْ عَائِشَةَ أُمِّ المُؤْمِنِينَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا، أَنَّ الحَارِثَ بْنَ هِشَامٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ سَأَلَ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ، كَيْفَ يَأْتِيكَ الوَحْيُ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «أَحْيَانًا يَأْتِينِي مِثْلَ صَلْصَلَةِ

"ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حارث بن ہشام نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: یا رسول اللہ، آپ پر وحی کیسے اترتی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ کبھی وحی مجھ پر گھنٹی کی آواز کی صورت میں آتی ہے۔ وحی کی یہ صورت مجھ پر گراں تر ہوتی ہے۔ جب یہ ختم ہوتی

الجَرَسِ، وَهُوَ أَشَدُّهُ عَلَيَّ، فَيُفْصَمُ عَنِّي وَقَدْ وَعَيْتُ عَنْهُ مَا قَالَ، وَأَحْيَانًا يَتَمَثَّلُ لِيَ المَلَكُ رَجُلًا فَيُكَلِّمُنِي فَأَعِي مَا يَقُولُ». قَالَتْ عَائِشَةُ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا: وَلَقَدْ رَأَيْتُهُ يَنْزِلُ عَلَيْهِ الوَحْيُ فِي اليَوْمِ الشَّدِيدِ البَرْدِ، فَيَفْصِمُ عَنْهُ وَإِنَّ جَبِينَهُ لَيَتَفَصَّدُ عَرَقًا.(رقم ۲)

ہے تو فرشتے کا کہا میں یاد کر چکا ہوتا ہوں۔ بعض اوقات فرشتہ انسانی صورت میں آ کر مجھ سے کلام کرتا ہے تو میں اس کا کہا ہوا یاد کر لیتا ہوں۔ عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ میں نے شدید سردی میں آپ کو دیکھا کہ وحی نازل ہوتی، جب رکتی تو آپ کی پیشانی پسینہ پسینہ ہو جاتی۔“

یہ روایت بھی انھی تصورات کی حامل ہے، مثلاً قرآن آپ کو یاد کرنا پڑتا تھا، جو کہ قرآن کی واضح تصریحات کے خلاف ہے۔

اسی طرح ہم نے اوپر یہ واضح کیا ہے کہ وحی آنے میں گھنٹیوں کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے۔ صرف تین طریقے قرآن مجید نے وحی کے بتائے ہیں:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ.(الشوریٰ ۴۲:۵۱)

ان تینوں طریقوں کی مثالیں بھی قرآن میں بیان ہوئی ہیں۔ پہلے طریقے کی مثالیں: ام موسیٰ کو وحی ہوئی تو انھیں کوئی تکلیف نہیں ہوئی (القصص ۲۸:۷)۔ حضرت زکریا کو یحییٰ علیہما السلام کی بشارت اللہ تعالیٰ نے دی تو ان کو کچھ بھی نہیں ہوا، بلکہ وہ تو اس قدر اطمینان سے تھے کہ اللہ سے نشانی طلب کر لی کہ اس کی کیا نشانی ہے کہ یہ وحی آپ کی طرف سے آئی ہے یا میرے دل کی تمنا یا وسوسہ تو نہیں ہے (مریم ۱۹:۲-۱۰)۔ اگر ان کے لیے بھی ’صلصلة الجرس‘ کا اہتمام ہوتا تو نشانی طلب نہ کرتے۔

دوسرے طریقے کی مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعۂ طور ہے، جہاں آپ کو نبوت عطا ہوئی۔ اس میں حضرت موسیٰ اس مزے سے بے تکلف باتیں کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عصا کا سوال کیا تو وہ اس کی تفصیلات بتانے لگے۔ اگر اس طرح کی تکلیف میں ہوتے جس طرح کی تکلیف اس روایت میں بتائی گئی ہے تو آپ یوں محو گفتگو نہ ہوتے، کیونکہ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن جیسی اہم وحی سے جلد فارغ ہونا چاہتے تھے تو یہ کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ حضرت موسیٰ اس تکلیف کے باوجود عصا کے بارے میں بکریاں چرانے اور لاٹھی کا سہارا لینے جیسے عام امور کو مزے مزے سے بیان کرتے جا رہے تھے، حالاں کہ واقعۂ ’لَنْ تَرٰىنِيْ‘ (الاعراف ۷:۱۴۳)

پر قیاس کہتا ہے کہ حضرت موسیٰ کی یہ وحی زیادہ بھاری ہونی چاہیے، اس لیے کہ وحی کے بجاے اللہ تعالیٰ براہ راست تکلم فرمارہے تھے۔

تیسرے طریقے کی مثالیں بہت ہیں۔ مثلاً سیدہ مریم کے لیے بشارت مسیح[۲۴] اور بیٹے کی عطا[۲۵] کے دو الگ الگ واقعات قرآن میں مذکور ہیں۔ دونوں میں ان کا رویہ ایسا ہی ہے کہ وہ بالکل نارمل دکھائی دیتی ہیں، بلکہ دوسرا واقعہ جس میں فرشتہ انسانی روپ میں آیا ہے، وہ مقام تو نہایت دل چسپ ہے۔ اس میں سیدہ مریم فرشتے سے لڑ رہی ہیں کہ میں تم سے پناہ چاہتی ہوں (مریم ۱۹: ۱۸)۔ اگر وہ کسی وحی کی کیفیت سے گزرتیں تو یقیناً وہ اس فرشتے کو انسان گمان کر کے پناہ نہ مانگتیں، کیونکہ فرشتوں سے وحی لینے کے ایک تجربہ سے وہ گزر چکی تھیں (آل عمران ۳: ۴۵)۔ پر ہماری یہ روایت بتاتی ہے کہ آخری نبی پر یہ وحی اس قدر گراں گزرتی تھی کہ سردیوں میں پسینے چھوٹ جاتے تھے۔ اب اس روایت کو ماننے کی ایک ہی صورت رہ جاتی ہے کہ ہم یا یہ مانیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے قرآن میں مذکور تین طریقوں سے الگ ایک چوتھا طریقہ اپنایا گیا تھا، جو کہ قرآن کے محولہ بالا صریح ارشاد (الشوریٰ ۴۲: ۵۱) کے خلاف ہے یا یہ مانا جائے کہ وحی کا طریقہ تو وہی تھا، مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سیدہ مریم سے بھی زیادہ نازک اندام تھے کہ آسان ترین طریقۂ وحی بھی برداشت نہ کر پاتے تھے (نعوذ باللہ)۔

اس سے صاف واضح ہے کہ یہ روایت بھی اسی بے اصل شجر سے پھوٹا شاخسانہ ہے۔ بعد ازاں درجۂ حدیث عطا کرنے کے لیے کتب حدیث میں درج کر دیا گیا۔ شاید ان روایات میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ آپ کی نبوت کسی سابق نبی کے مشابہ نہیں ہے، آپ پر وحی تکلیف دے کر آتی تو آپ وحی سے جان چراتے۔ آپ کو وحی بغیر اہتمام کے دی جاتی، آپ کو خود ہی یاد کرنا پڑتی۔ آپ کو قرآن کے کھو جانے کا ڈر رہتا تھا، اس لیے جھٹ پٹے میں یاد کرنے کی سعی فرماتے۔ ایسی ہی ایک روایت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے منسوب کی گئی ہے، اس میں بھی وحی کو ایک کرب ناک عمل بتایا گیا ہے، جس سے آپ کے چہرۂ مبارک کا رنگ بدل جاتا تھا (مسلم، رقم ۲۳۳۴)۔ وہ بھی اسی درایت کی روشنی میں دیکھی جا سکتی ہے۔

۲۴۔ آل عمران ۳: ۴۵۔ 'اِذۡ قَالَتِ الۡمَلٰٓئِکَۃُ یٰمَرۡیَمُ اِنَّ اللّٰہَ یُبَشِّرُکِ بِکَلِمَۃٍ مِّنۡہُ ٭ۖ اسۡمُہُ الۡمَسِیۡحُ عِیۡسَی ابۡنُ مَرۡیَمَ وَجِیۡہًا فِی الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَۃِ وَمِنَ الۡمُقَرَّبِیۡنَ'۔

۲۵۔ مریم ۱۹: ۱۹۔ 'قَالَ اِنَّمَاۤ اَنَا رَسُوۡلُ رَبِّکِ ٭ۖ لِاَہَبَ لَکِ غُلٰمًا زَکِیًّا'۔

۳۔ حارث بن ہشام نے یہ سوال پوچھا تو سیدہ عائشہ نے اپنا ایک مشاہدہ بیان کیا۔ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم یہ جانتے ہیں کہ وحی بے شمار مواقع پر نازل ہوئی۔ کبھی گھر میں، کبھی بستر میں، کبھی مجلس میں، کبھی نماز میں، کبھی کہیں کبھی کہیں۔ حارث بن ہشام کے سوا کسی نے نہ پوچھا، اور سیدہ کے سوا کسی نے نہ دیکھا؟ اتنے طویل عرصے تک ہونے والے ایک عمل کے تو اتنے گواہ ہونے چاہییں تھے کہ یہ بات ہر ہر فرد کو معلوم ہوتی۔ مکہ میں تیرہ برس تک یہ سلسلہ جاری رہا، تو مثلاً ابو لہب تو آپ کا چچا تھا، مکہ کے تیرہ برسوں میں ایک دن بھی یہ اتفاق نہ ہوا کہ وہ وحی اترتے ہوئے آپ کو دیکھ لیتا! سیدہ خدیجہ ہی نے بلا بھیجا ہوتا کہ آ کر دیکھو کہ وحی کیسے اترتی ہے۔ قرآن یہ تو کہتا ہے کہ تم اس سے اس بات میں بحث کر رہے ہو کہ جو اس نے آنکھوں سے دیکھی ہے (النجم ۵۳: ۴-۱۸)، مگر یہ نہیں کہتا کہ آؤ، اس پر وحی اترتے تم بھی دیکھ لو، کیا کوئی شخص خود پر ایسی حالت طاری کر سکتا ہے!۔ وہ آپ کی نبوت کے ثبوت میں یہ تو دعویٰ کرتا دکھائی دیتا ہے کہ 'وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى' (النجم ۵۳: ۳)، اور یہ دعویٰ کرتا ہے کہ آپ پر جن نہیں آتے (الشعراء ۲۶: ۲۱۰، ۲۲۱-۲۲۳)، یہ دعویٰ کرتا ہے کہ آپ شاعر نہیں ہیں (یٰس ۳۶: ۶۹)، وہ یہ دعویٰ بھی کرتا ہے کہ جبریل آپ کے دل پر کلام نازل کرتے ہیں (البقرہ ۲: ۹۷)، وہ یہ دعویٰ بھی کرتا ہے کہ آپ پہلے انبیا کی طرح ہیں (الاحقاف ۴۶: ۹)، لیکن ان سب سے زیادہ آسان اور مشاہدہ میں آنے والی بات آپ کی حالت زار تھی، جو نزول وحی کے دوران میں ہوتی تھی۔ اس میں بس اتنا ہی کہنا تھا کہ اس کو دیکھو جب اس پر وحی آتی ہے۔ ظاہر ہے، ایسا کچھ تھا ہی نہیں کہ دیکھنے کو کہا جاتا۔

۴۔ مضمون کے پہلے حصے میں ہم آیات کی تحلیل کے دوران میں یہ بات کر آئے ہیں کہ سورۂ نجم (۵۳) میں قرآن کی یہ آیات اس بات کی نفی کرتی دکھائی دیتی ہیں کہ آپ پر وحی گراں گزرتی تھی: 'مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى' (۱۱) اور یہ آیات کہ 'مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى' (۱۷) 'لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى' (۱۸)۔ پسینے چھوٹ جانے تک کی تکلیف دینے والی حالت میں یہ مشاہدات ایسے نہیں ہو سکتے۔ روایات کے مطابق تو سورۂ نجم میں مذکور واقعات میں وحی کافی شدید رہی ہو گی، اس لیے کہ اس میں جبریل علیہ السلام انسانی نہیں، بلکہ اپنی اصل صورت میں ظاہر ہوئے تھے۔

۵۔ ان دونوں روایات میں ایک قدر مشترک ہے کہ دونوں صحابہ مومنین متاخرین میں سے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ جو تحریک لسان کی نوعیت متعین کر رہے ہیں، وہ آٹھ ہجری میں گیارہ برس کی عمر میں ایمان لائے ہیں۔ جس وقت سورۂ قیامہ اتری ہو گی، شاید اس وقت ان کے عرصۂ حیات کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا۔ حارث بن ہشام، جو وحی کی کیفیت متعین کر رہے ہیں، وہ فتح مکہ کے موقع پر ایمان لائے ہیں۔ البتہ سیدہ عائشہ قدیم الایمان ہیں،

لیکن وہ کہیں اور وحی کی نوعیت بتاتے دکھائی نہیں دیتیں۔ اس روایت میں آپ کی طرف نسبت کر دی گئی ہے، وہ اس بات کی ذمہ دار نہیں ہیں۔

٦۔ سورۂ قیامہ اور طٰہٰ کی آیات پر بحث کرتے ہوئے ہم بتا چکے ہیں کہ حضرت ابن عباس سے چار کے قریب آرا منسوب ہیں، جو اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ یہ روایات الگ الگ اشخاص نے تراشی ہیں اور محدثین کا جمع کرنا ان کے تفاوت و تضاد اور حقائق کے خلاف ہونے کے مبرہن کرنے کا سبب بن گیا ہے۔

٧۔ حضرت ابن عباس کے نام سے منسوب ان روایات میں سے بعض میں یہ کہا گیا ہے کہ 'جَمْعُهُ لَكَ فِي صَدْرِكَ'، تو یہ محض ایک تفسیری رائے نہیں ہے، کسی قرآن فہمی کی غرض سے یا لفظوں کے اقتضا سے پیدا ہوئی ہو، بلکہ یہ جمع قرآن سے متعلق اس سازش کا حصہ ہے جس میں قرآن عہد نبوی کے بجائے عہد صحابہ میں جمع ہونا بتایا گیا ہے۔ سورۂ قیامہ کی یہ آیت، اس بات کا بین ثبوت ہے کہ قرآن اللہ کے رسول کے ہاتھوں جمع ہوا تھا۔ مگر اس بین ثبوت پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ تفسیر، جو کسی طرح لفظ 'جَمْعُهُ' کے معنی نہیں ہو سکتے، تراشی گئی ہے۔

ان کے علاوہ درایت کے مزید نکات بھی پیش نظر ہیں، مگر بخوف طوالت، اسے یہیں ختم کرتے ہیں۔ ان نکات سے درج ذیل باتیں واضح ہیں:

١۔ یہ روایات تراشی گئی ہیں، اور ابن عباس رضی اللہ کے نام منسوب کر دی گئی ہیں۔

٢۔ ان روایات کی زبان اور انتشار مضمون سے ثابت ہے کہ یہ ایک منبع سے نہیں پھوٹیں۔

٣۔ ان میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نزول وحی کے باب میں تمام انبیا سے مختلف دکھایا گیا ہے، جو کسی نبی کے شایان شان نہیں۔

٤۔ وحی کے دوران میں آپ کسی تکلیف سے گزرتے تھے، یہ بات قرآن اور دیگر انبیا کے واقعات سے ٹکراتی ہے۔

ان روایات میں جمع قرآن کے اس عمل پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے جس کے بعد جمع قرآن کی وہ تمام تاریخ رقم کرنا ممکن ہو سکے جو پہلے اور تیسرے خلیفہ کے عہد کے حوالے سے کتب میں تحریر کی گئی ہے۔

٥۔ ان روایات سے جو تفسیر سامنے آتی ہے، وہ کسی طور قرآن کے الفاظ اور نصوص سے مطابقت نہیں رکھتی۔

'اللّٰھم أَرِنَا الحَقَّ حقًّا وَارْزُقْنَا اتِّبَاعَهُ وَأَرِنَا البَاطِلَ بَاطِلًا وَارْزُقْنَا اجْتِنَابَهُ'۔

مقالات

ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر

نسخ القرآن بالسنۃ: امام شافعی کے موقف پر اصولیین کے معارضات

اپنی کتاب ''قرآن وسنت کا باہمی تعلق''، میں سنت کے ذریعے سے قرآن کے حکم کی تنسیخ سے متعلق امام شافعی کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے ہم نے حسب ذیل نکات کا ذکر کیا ہے:

۱۔ کتاب اللہ اور سنت، دونوں کا منبع ایک ہی چیز، یعنی وحی الٰہی ہے، اس لیے اطاعت واتباع کے لحاظ سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

۲۔ قرآن یا حدیث میں کوئی حکم عموم کے اسلوب میں وارد ہو تو وہ تفصیل وتوضیح کا محتمل ہوتا ہے اور اگر متکلم کی طرف سے اس میں کوئی تخصیص کی جائے تو وہ متکلم کی مراد کی وضاحت ہوتی ہے۔ چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بھی وحی پر مبنی ہیں، اس لیے احادیث میں وارد تمام تخصیصات اللہ تعالیٰ ہی کی مراد کی وضاحت کا درجہ رکھتی ہیں۔

۳۔ جن امور میں قرآن نے کوئی حکم بیان کیا ہو، ان میں سنت ہر حال میں قرآن کے تابع اور اس کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ہے۔ اس لیے سنت، قرآن کے کسی حکم کو منسوخ نہیں کر سکتی اور کتاب اللہ میں وارد کسی حکم کا ناسخ بھی کتاب اللہ ہی میں نازل ہونا ضروری ہے۔

امام شافعی کے اس موقف کے آخری نکتے، یعنی سنت سے قرآن کی تنسیخ کے عدم جواز سے علماے اصول کی

ایک بڑی جماعت نے اختلاف کیا ہے، جس میں خود شافعی روایت کے بڑے اصولیین بھی شامل ہیں۔ ان حضرات کی طرف سے امام صاحب کے موقف پر تنقید کے لیے جو بنیادی اور اہم معارضات پیش کیے گئے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے کسی حکم کے منسوخ ہونے کا علم وحی سے ہی ہو سکتا ہے۔ قرآن اور سنت چونکہ دونوں وحی پر مبنی ہیں، اس لیے قرآن کے کسی حکم کا ناسخ قرآن میں وارد ہو یا سنت میں، اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

۲۔ قرآن کے کسی حکم کی تخصیص سنت میں بیان ہونا اہل علم کے مابین مسلم ہے۔ نسخ بھی تخصیص کے مماثل ہے، کیونکہ دونوں میں مختلف پہلوؤں سے حکم کے دائرۂ عمل کی تحدید واضح کی جاتی ہے۔ چنانچہ جب سنت سے قرآن کی تخصیص کا جواز مسلم ہے تو نسخ کا جواز نہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں۔

۳۔ قرآن مجید نے احکام شرعیہ کی تبیین کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری قرار دیا ہے۔ بیان ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے، جس میں دوسرے پہلوؤں کے ساتھ ساتھ کسی حکم کے منسوخ ہونے کی وضاحت بھی شامل ہے، اس لیے قرآن کی بیان کردہ ذمہ داری کے تحت سنت، قرآن کے کسی حکم کا منسوخ ہونا بھی بیان کر سکتی ہے۔

۴۔ سنت میں وارد بہت سے احکام کو ان کی نوعیت کے لحاظ سے نسخ ہی قرار دیا جا سکتا ہے اور اس کے علاوہ ان کی کوئی معقول توجیہ ممکن نہیں۔

ہم نے اپنی کتاب میں واضح کیا ہے کہ ہمارے نقطۂ نظر سے اصول فقہ کی روایت میں نسخ القرآن بالسنۃ کے جواز کا موقف عموماً قبول کر لیے جانے کا اہم ترین سبب مذکورہ استدلالات میں سے چوتھا اور آخری استدلال ہے، جو ایک عملی مسئلے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اصولی نوعیت کے استدلالات جو پہلے تین معارضات میں ذکر کیے گئے ہیں، ثانوی طور پر اور بحث و نظر کی ضرورت کے تحت پیدا ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے ہماری کتاب میں چوتھے نکتے کی وضاحت تو کافی تفصیل سے کی گئی ہے، لیکن امام شافعی کے موقف پر اصولی نوعیت کے معارضات پر زیادہ تبصرہ نہیں کیا گیا۔ زیر نظر سطور میں ہماری کوشش ہو گی کہ بحث کے اس پہلو کا بھی جائزہ لے لیا جائے اور مذکورہ اصولی معارضات کا ایک ناقدانہ تجزیہ پیش کر دیا جائے۔

سنت کا مبنی بر وحی ہونا

سب سے پہلا اور اہم معارضہ یہ پیش کیا گیا ہے، جسے اصول فقہ کی روایت میں ایک عمومی قبولیت بھی حاصل

ہوئی ہے کہ جب قرآن اور سنت، دونوں وحی پر مبنی ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم وحی الٰہی ہی کی روشنی میں شریعت کے احکام بیان فرماتے ہیں تو پھر نسخ کے بیان کے لیے اس اصرار کا کوئی جواز نہیں کہ قرآن میں وارد حکم کا ناسخ بھی قرآن میں ہی نازل ہو۔

امام الحرمین الجوینی نے اس استدلال کی وضاحت یوں کی ہے:

قطع الشافعي جوابه بأن الكتاب لا ينسخ بالسنة وتردد قوله في نسخ السنة بالكتاب والذي اختاره المتكلمون وهو الحق المبين أن نسخ الكتاب بالسنة غير ممتنع والمسألة دائرة على حرف واحد وهو أن الرسول لا يقول من تلقاء نفسه أمرًا وإنما يبلغ ما يؤمر به كيف فرض الأمر ولا امتناع بأن يخبر الرسول الأمة مبلغًا بأن حكم آية يذكرها قد رفع عنكم ويرجع حاصل القول في المسألة إلى أن النسخ لا يقع إلا بأمر الله تعالىٰ ولا ناسخ إلا الله والأمر كيف فرض جهات تبليغه لله تعالىٰ فهذا القدر فيه مقنع.

(البرہان فی اصول الفقہ ۲/ ۲۵۳)

”امام شافعی کا موقف اس حوالے سے تو حتمی ہے کہ کتاب اللہ کو سنت سے منسوخ نہیں کیا جا سکتا، جب کہ سنت کو کتاب سے منسوخ کرنے میں ان کا موقف حتمی نہیں ہے۔ متکلمین نے جو موقف اختیار کیا ہے اور وہی واضح طور پر درست موقف ہے، وہ یہ ہے کہ کتاب اللہ کا حکم سنت سے منسوخ ہونے میں کوئی مانع نہیں۔ اس بحث کا مدار ایک ہی نکتے پر ہے اور وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جانب سے کوئی بات نہیں کہتے، بلکہ جو آپ کو حکم دیا جائے، اسی کا ابلاغ کرتے ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ اگر امت تک یہ اطلاع پہنچائیں کہ فلاں آیت کا حکم اب باقی نہیں رہا تو اس میں کوئی مانع نہیں۔ حاصل کلام یہی ہے کہ نسخ اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے ہوتا ہے اور اللہ کے سوا کوئی ناسخ نہیں ہو سکتا، لیکن سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس حکم کے ابلاغ کی کیا صورت اختیار کرتا ہے (اور وہ سنت کے ذریعے سے بھی ہو سکتا ہے)۔ یہی نکتہ اس بحث میں فیصلہ کن ہے۔“

نسخ القرآن بالسنۃ کے جواز کے قائل تمام اصولیین کے ہاں اسی نکتے، یعنی قرآن اور سنت کے مبنی بر وحی

ہونے کو بنیاد بنایا گیا ہے، البتہ اس کی تفصیل میں ان کے مابین اہم اختلافات بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً ابن حزم نے سرے سے وحی متلو اور غیر متلو اور متواتر و آحاد کے فرق کو ہی نظر انداز کر دیا اور یہ کہا کہ اللہ نے جو بھی وحی نازل کی ہے، چاہے وہ قرآن میں ہو یا حدیث میں، ایک ہی حیثیت رکھتی ہے اور ان میں فرق بس ظاہری صورت کا ہے، اس لیے احکام کی تعبیر و تشریح کے باب میں یہ امتیاز کرنا ہی سرے سے درست نہیں کہ یہ آیت ہے اور یہ حدیث ہے۔ یہ دونوں وحی ہیں اور جیسے کتاب اللہ کی آیات ایک دوسرے کو منسوخ کر سکتی ہیں، اسی طرح احادیث بھی آیات کو منسوخ کر سکتی ہیں۔ شافعی اصولیین نے ابن حزم کی طرح آیت اور حدیث کے فرق کو بالکل ختم تو نہیں کیا، لیکن یہ نکتہ انھوں نے بھی قبول کر لیا کہ دونوں چونکہ وحی پر مبنی ہیں، اس لیے تغییر و نسخ کے تعلق سے دونوں کے احکام ایک جیسے ہونے چاہییں۔ حنفی فقہا نے اس میں ایک مزید شرط یہ شامل کی کہ چونکہ قرآن کے حکم میں تبدیلی کا معاملہ ہے، جو بہر حال قطعی الثبوت ہے، اس لیے حدیث کو بھی اس درجے کا ہونا چاہیے کہ اس سے کتاب اللہ کے حکم میں تبدیلی کرتے ہوئے اس کے ثبوت کے حوالے سے مکمل اطمینان ہو۔ چنانچہ وہ اخبار آحاد سے قرآن کے نسخ کا جواز اس صورت میں مانتے ہیں جب حدیث یا تو مشہور و متواتر ہو یا اس کو اہل علم کے ہاں تلقی بالقبول حاصل ہو۔

اصولیین کی طرف سے جو معارضہ پیش کیا گیا ہے، وہ اول وہلہ میں قوی دکھائی دیتا ہے اور یہ سوال بظاہر جائز معلوم ہوتا ہے کہ جب امام شافعی کے نزدیک قرآن اور حدیث، دونوں کا ماخذ وحی ہے اور اسی بنیاد پر وہ دونوں کے حجت اور واجب الاتباع ہونے پر اصرار کرتے ہیں، اور دوسری طرف ان کے نزدیک شریعت میں بعض احکام کا بعض کے لیے ناسخ ہونا بھی مسلم ہے تو پھر سنت کے لیے قرآن کا ناسخ ہونے کا جواز وہ آخر کیوں نہیں مانتے؟ اگر قرآن کی ایک آیت دوسری آیت کو اور ایک حدیث دوسری حدیث کو منسوخ کر سکتی ہے، کیونکہ دونوں وحی پر مبنی ہیں تو کوئی حدیث قرآن کی کسی آیت کو منسوخ کیوں نہیں کر سکتی، جب کہ حدیث بھی وحی پر مبنی ہوتی ہے؟ بالفاظ دیگر جب دونوں وحی پر مبنی کلام ہیں اور ان دونوں کے بیانات کو ایک ہی متکلم کے اجزاے کلام کے طور پر دیکھنا ضروری ہے اور اجزاے کلام کے باہمی تعلق کی دوسری تمام صورتیں جن کا تعلق تبیین و توضیح اور تخصیص وغیرہ سے ہے، قرآن اور حدیث کے مابین موجود ہیں تو اس خاص تعلق کے ممنوع ہونے کی کیا وجہ ہے جسے نسخ سے تعبیر کیا جاتا ہے؟

تاہم امام شافعی کے اصولی فریم ورک کو اس کی کلیت میں ملحوظ رکھا جائے تو ان کے موقف پر یہ معارضہ پیش

نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امام صاحب کے اصولی موقف میں صرف یہی ایک نکتہ نہیں ہے کہ سنت وحی پر مبنی ہوتی ہے، اس کے ساتھ، بلکہ اس سے پہلے ایک بنیادی نکتہ یہ بھی ہے کہ احکام شرعیہ کے بیان میں اصل اور اساسی ماخذ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور کتاب اللہ میں ہی تمام تکلیفی امور سے متعلق بنیادی رہنمائی موجود ہے۔ امام شافعی کے الفاظ میں:

فليست تنزل في أحد من أهل دين الله نازلة إلا وفي كتاب الله الدليل على سبيل الهدى فيها.(الرسالہ ۲۰)

”اللہ کے دین کو ماننے والوں کو جو بھی مسئلہ درپیش ہو، اللہ کی کتاب میں اس سے متعلق درست راستے کی رہنمائی موجود ہوتی ہے۔“

اس کی تفصیل امام شافعی نے یوں کی ہے کہ جملہ تکلیفی امور سے متعلق کتاب اللہ میں پانچ طریقوں سے انسانوں کو رہنمائی فراہم کی گئی ہے:

پہلا یہ کہ دین کے بنیادی فرائض، مثلاً نماز اور زکوٰۃ کو اور قطعی محرمات جیسے زنا، شراب اور حرام جانوروں کے گوشت کو تصریحاً و نصاً کتاب اللہ میں بیان کر دیا گیا ہے۔

دوسرا یہ کہ بعض احکام، مثلاً طہارت حاصل کرنے کے لیے وضو کے کچھ پہلو کتاب اللہ میں بیان کر دیے گئے ہیں، جب کہ کچھ دیگر پہلوؤں کی وضاحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے ذریعے سے کر دی گئی ہے۔

تیسرا یہ کہ بعض شرائع، مثلاً نماز، زکوٰۃ اور حج کا مجملاً ذکر کر کے ان کی تفصیلات کی وضاحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کر دی گئی ہے۔

چوتھا یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو فرض قرار دیا گیا ہے، جس کی رو سے قرآن کی تبیین و تشریح کے علاوہ ان تمام امور میں بھی آپ کے دیے ہوئے احکام کی اتباع لازم ہے، جن کا قرآن مجید نے ذکر نہیں کیا۔

پانچواں یہ کہ کتاب اور سنت میں منصوص امور کے علاوہ باقی معاملات میں اہل ایمان کو مکلف ٹھیرایا گیا ہے کہ وہ قیاس اور اجتہاد کی مدد سے کسی نتیجے تک پہنچیں اور اس پر عمل کریں (الرسالہ ۲۱-۳۴)۔

اس بنیادی فریم ورک میں امام شافعی احکام شرعیہ کے بیان میں سنت کا وظیفہ اور اس کا دائرہ بھی متعین کرتے ہیں۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ دین کا بنیادی ماخذ اللہ کی کتاب ہے اور اللہ کا پیغمبر بھی کتاب اللہ کی اتباع کا مکلف ہے۔ چنانچہ پیغمبر کو بذریعہ وحی کتاب اللہ کے علاوہ جو رہنمائی دی جائے گی، وہ یا تو ان امور سے متعلق

ہو گی جن کے بارے میں کتاب اللہ خاموش ہے اور یا کتاب اللہ کے کسی حکم کی توضیح و تفصیل پر مشتمل ہو گی۔ توضیح و تفصیل سے ہٹ کر کتاب اللہ کے حکم کے معارض کوئی حکم بیان کرنا سنت کے وظیفے میں شامل نہیں ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی حکم میں تبدیلی کرنی ہے تو اس سے متعلق کتاب اللہ میں ہی وحی نازل کی جائے گی، جس میں اصل حکم نازل ہوا تھا، کیونکہ جب پیغمبر خود کتاب اللہ کی پیروی کا مکلف ہے تو پیغمبر پر کتاب اللہ کے علاوہ جو وحی نازل کی جائے، اس میں بھی یہ التزام ضروری ہے کہ وہ کتاب اللہ کے تابع اور اس کی تشریح و تفصیل کرنے والی ہو، کتاب اللہ کے حکم کو تبدیل کرنے والی نہ ہو۔ بالفاظ دیگر یہ بات تو بالکل بجا ہے کہ جو رہنمائی قرآن میں دی گئی ہے، وہ بھی اللہ کی طرف سے ہے اور جو قرآن سے باہر دی گئی، وہ بھی اللہ ہی کی طرف سے ہے، لیکن اللہ نے اپنی کتاب کو دین میں جو حیثیت دی ہے اور پیغمبر پر بھی اس کی اتباع کو لازم قرار دیا ہے، اس کی رو سے یہ ضروری ہے کہ کتاب اللہ سے باہر جو رہنمائی پیغمبر کو دی جائے، وہ بھی کتاب اللہ کے تحت اور اس کے تابع ہو، اس کے مساوی یا اس پر حاکم بن کر اس کے احکام کو تبدیل کرتی ہوئی دکھائی نہ دے۔

امام شافعی فرماتے ہیں:

فإذا كان الله عزوجل فرض على نبيه اتباع ما أنزل إليه وشهد له بالهدى وفرض على الناس طاعته... فقامت السنة مع كتاب الله هذا المقام، لم تكن السنة لتخالف كتاب الله ولا تكون السنة إلا تبعًا لكتاب الله بمثل تنزيله أو مبينة معنى ما أراد الله تعالىٰ، فهي بكل حال متبعة كتاب الله.

(الام ۱/۹۷)

”جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر اللہ کی نازل کردہ وحی کی اتباع کو فرض ٹھیرایا اور اس کے ہدایت ہونے کی گواہی دی ہے اور اپنے بندوں پر بھی اس کی پیروی کو لازم قرار دیا ہے، ... اور سنت کی حیثیت اللہ کی کتاب کے ساتھ یہ ہے، تو پھر یہ نہیں ہو سکتا کہ سنت، کتاب اللہ کی مخالفت کرے۔ سنت ہمیشہ اللہ کی کتاب کے مطابق ہی ہو گی، چاہے اس میں اسی حکم کو بیان کیا جائے جو کتاب اللہ میں اترا ہے یا اللہ کی مراد کو واضح کیا جائے۔ بہر حال سنت، کتاب اللہ کے تابع ہی ہوتی ہے۔“

امام شافعی نے اس زاویۂ نظر کی مزید تائید کے لیے قرآن مجید کی متعدد آیات کا حوالہ بھی دیا ہے، جن میں اللہ کے حکم میں تبدیلی اور نسخ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ اللہ کا پیغمبر اپنی طرف سے خدا کے کلام میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ مثلاً:

قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ. (یونس۱۰:۱۵)	’’تم کہہ دو کہ مجھے یہ حق نہیں ہے کہ میں اپنی طرف سے اس کو بدل ڈالوں۔ میں تو بس اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر نازل کی جاتی ہے۔‘‘
مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا.(البقرہ۲:۱۰۶)	’’ہم جو بھی آیت منسوخ کرتے ہیں یا اسے (پیغمبر کو) بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی دوسری آیت لے آتے ہیں۔‘‘
وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ. (النحل۱۶:۱۰۱)	’’اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت کو تبدیل کرتے ہیں۔‘‘
يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ. (الرعد۱۳:۳۹)	’’اللہ جو چاہتا ہے، مٹا دیتا ہے اور جو چاہتا ہے، باقی رکھتا ہے۔‘‘

مذکورہ آیات کا حوالہ دینے سے امام صاحب کا مقصود اسی نکتے کو واضح کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی اتباع اور اطاعت کو یقیناً لازم قرار دیا ہے، لیکن بیان احکام میں اپنے کلام اور اپنے پیغمبر کے کلام کو بالکل یکساں قرار دیتے ہوئے ایسا اسلوب اختیار نہیں کیا کہ متبوع اور تابع کا امتیاز ہی ظاہراً ختم ہو جائے۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے احکام کے نسخ اور تبدیلی کی نسبت خود اپنی طرف کی ہے تو اس سے اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ کسی منسوخ حکم کا ناسخ بھی اللہ ہی کے کلام میں وارد ہوگا۔

استدلال کے اس زاویے کو امام شافعی کے ناقدین درست طور پر نہیں سمجھ سکے اور مذکورہ نصوص میں تبدیلی کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کیے جانے کو مطلقاً وحی پر محمول کر لیا، جس میں قرآن سے باہر نازل کی جانے والی وحی بھی شامل ہو جاتی ہے۔ پھر اس پر یہ استدلال متفرع کر لیا گیا کہ وحی متلو اور غیر متلو، چونکہ دونوں وحی کی اقسام ہیں، اس لیے امام شافعی کا ان آیات سے استنباط بے محل ہے، حالاں کہ امام شافعی کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے خود اپنی وحی کو دو صورتوں میں تقسیم کیا ہے اور ان میں سے ایک صورت، یعنی کتاب اللہ کو اصل اور مرکز اتباع قرار دیا ہے، جس کی پابندی پیغمبر پر بھی لازم کی گئی ہے تو قرآن کے علاوہ وحی کی دوسری صورت کے متعلق یہ التزام بھی کیا ہے کہ اس کا قرآن میں نازل کردہ وحی کے ساتھ اتباع ہی کا تعلق ہو۔ اس حیثیت میں کتاب اللہ کے حکم کے مختلف پہلوؤں کی توضیح و تبیین تو وحی غیر متلو کا وظیفہ ہو سکتی ہے، لیکن قرآن کے حکم کو

تبدیل کر دینا وحی غیر متلو کی اس تابع حیثیت کے خلاف ہے، اس لیے حدیث کتاب اللہ کے کسی حکم کو منسوخ نہیں کر سکتی۔ ہاں، کتاب اللہ میں ناسخ و منسوخ احکام کے باہمی تعلق کو سمجھنے میں کوئی اشکال یا خفا ہو تو اس کی وضاحت یقیناً وحی غیر متلو کے دائرے میں آتی ہے۔

مذکورہ تمام توضیحات کو مد نظر رکھتے ہوئے، اگر امام شافعی کے استدلال کو دیکھا جائے تو اس کے بنیادی نکتے کی مضبوطی اور ناقدین کے معارضے کی کم زوری واضح طور پر سمجھی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام الحرمین نے اپنے خیال میں جس نکتے کو اس بحث میں قاطع اور فیصلہ کن قرار دیا تھا، وہ اصول فقہ کی روایت میں بحث کا خاتمہ نہیں کر سکا اور جہاں علماے اصول کی ایک بڑی جماعت نسخ القرآن بالسنۃ کی قائل رہی ہے، وہاں کبار اہل علم امام شافعی کے بنیادی نکتے کے وزن کو محسوس کرتے ہوئے اس کی تائید بھی کرتے چلے آ رہے ہیں، جس کی تفصیل درج ذیل مصادر میں دیکھی جا سکتی ہے:

قاضی ابو بکر الباقلانی الشافعی (وفات ۴۰۳ھ)	التقريب والإرشاد
ابو الطیب سہل بن محمد الصعلوکی (وفات ۴۰۴ھ)	الإبهاج فی شرح المنهاج (تاج الدين السبکی)
ابو اسحاق الاسفرائنی (وفات ۴۱۸ھ)	ایضاً
ابو منصور البغدادی (وفات ۴۲۹ھ)	ایضاً
الماوردی (وفات ۴۵۰ھ)	الحاوي الكبير
ابو اسحاق الشیرازی الشافعی (وفات ۴۷۶ھ)	التبصرة في أصول الفقه
ابو المظفر السمعانی الشافعی (وفات ۴۸۹ھ)	قواطع الأدلة في الأصول
علامہ طیبی الشافعی (وفات ۷۴۳ھ)	حاشية الطيبي على الكشاف
تاج الدین السبکی الشافعی (وفات ۷۷۱ھ)	الإبهاج في شرح المنهاج
قاضی ابو یعلیٰ الحنبلی (وفات ۴۵۸ھ)	العدة في أصول الفقه
ابن الجوزی (وفات ۵۹۷ھ)	نواسخ القرآن
ابن تیمیہ الحنبلی (وفات ۶۵۲ھ)	المسودة في أصول الفقه
مرعی بن یوسف الکرمی الحنبلی (وفات ۱۰۳۳ھ)	قلائد المرجان في بيان الناسخ والمنسوخ في القرآن

موجودہ دور میں ہندوستان میں فراہی مکتب فکر نے بھی اسی موقف کو اختیار کیا اور سنت سے قرآن کی تنسیخ کے عدم جواز پر امام شافعی کے نقطۂ نظر کی بھرپور تائید کی ہے۔ جناب جاوید احمد غامدی نے اس حوالے سے معارضین کے بنیادی استدلال کی کم زوری کو مختلف پہلوؤں سے یوں واضح کیا ہے:

”قرآن مجید سے واقف ہر صاحب نظر اِس بات کا اعتراف کرے گا کہ وہ منتشر اقوال کی صورت میں روایت بالمعنیٰ کے طریقے پر امت کو منتقل نہیں ہوا ہے۔ خدا کا یہ فرمان ایک مربوط کلام ہے جو ابواب و سور میں تقسیم اور کتاب کی شکل میں مرتب ہے۔ اِس کی ہر آیت اپنے سابق و لاحق سے متعلق، اپنے سیاق و سباق میں محدود اور ایک مجموعی نظام میں بندھی ہوئی ہے۔ اِس کی ترتیب خود اِس کے نازل کرنے والے نے قائم کی ہے اور اِس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اُس نے اپنے اوپر لی ہے۔ یہ قول متواتر کے ذریعے سے امت کو ملا ہے۔ اِس میں روایت باللفظ کا التزام کیا گیا ہے۔ اِس کی حجت حجت بالغہ اور اِس کے لفظ و معنی کی دلالت قطعی ہے۔ لفظ 'قرآن' کا اطلاق صرف اِسی پر کیا جاتا ہے۔ کلام الٰہی صرف یہی ہے۔ اِس کے سوا کوئی اور چیز، خواہ وہ وحی خفی ہو یا وحی جلی، نہ کلام الٰہی ہے اور نہ اُسے قرآن قرار دیا جا سکتا ہے۔ وحی خفی کے ذریعے سے اگر کوئی چیز پیغمبر کو ملتی ہے تو وہ قرآن کا حصہ نہیں بن جاتی، پیغمبر کی حدیث اور پیغمبر کی سنت ہی کہلاتی ہے۔

یہ سب وہ ناقابل تردید حقائق ہیں جو نہ حال کے لیے نئے ہیں، نہ ماضی میں لوگ اِن سے ناواقف تھے اور نہ 'نسخ القرآن بالسنة' کے قائل ہمارے اِن بزرگوں کی نگاہوں سے یہ اوجھل رہے ہوں گے۔ لیکن اِسے کیا کہیے کہ اُنھوں نے اِن سب کو نظر انداز کر دیا۔ متلو اور غیر متلو کا فرق اگر اُن کے نزدیک قابل لحاظ نہ تھا تو یہ سارے امتیازات بھی ایسے معمولی اور ناقابل التفات تھے کہ اِن سے صرف نظر کر کے اُنھوں نے یہ رائے قائم کی کہ قرآن مجید اور وحی خفی در حقیقت ایک ہی چیز ہیں؟ یہ حضرات اِسے عقلاً جائز ٹھیراتے ہیں، دراں حالیکہ کوئی عاقل اِس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ وحی خفی سے وحی جلی کو، روایت بالمعنیٰ سے روایت باللفظ کو، خبر مظنون سے حدیث قطعی کو اور رسول کے قول و فعل سے کلام الٰہی کو منسوخ کیا جا سکتا ہے یا اُس کے مدعا میں کوئی تبدیلی کی جا سکتی ہے۔

مقام افسوس ہے کہ ہمارے اِن بزرگوں نے قرآن کی حقیقت بس اتنی ہی سمجھی کہ وہ وحی کے ذریعے سے نازل ہوا ہے۔ وہ اگر موجود ہوتے تو ہم اُن کی خدمت میں عرض کرتے کہ وہ قرآن کا مقام خود قرآن ہی سے معلوم کریں۔ وہ اُنھیں بتائے گا کہ اُس کی حقیقت محض یہی نہیں کہ وہ وحی متلو ہے۔ وہ تو سلسلۂ وحی کا مہیمن، دین کی برہان قاطع، حق و باطل کا معیار، خدا اور خدا کے رسولوں کی طرف منسوب ہر چیز کے لیے فرقان اور

زمین پر خدا کی میزان ہے۔ ’اَللّٰہُ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ وَالۡمِیۡزَانَ‘ (اللہ ہی ہے جس نے حق کے ساتھ کتاب اتاری، یعنی میزان نازل کی)۔ ہر چیز اب اِسی میزان پر تولی جائے گی۔ اُس کے لیے کوئی چیز میزان نہیں ہے۔ ہر وہ شخص جو قرآن کے اِس مقام سے واقف ہے، بغیر کسی تردد کے مانے گا کہ وحی خفی تو ایک طرف، اگر کوئی وحی جلی بھی ہوتی تو وہ خدا کی اِس میزان میں کوئی کمی بیشی کرنے کی مجاز نہ تھی۔ وہ بہر حال تسلیم کرے گا کہ قرآن کو صرف قرآن منسوخ کر سکتا ہے۔ قرآن پر قرآن سے باہر کی کوئی چیز، جب تک وہ خود اِس کی اجازت نہ دے، کسی طرح اثر انداز نہیں ہو سکتی۔“ (برہان ۵۰-۵۲)

”ایسا حکیمانہ اور معجز کلام صرف خدا کا رسول ہی پیش کر سکتا ہے جس میں خدا بولتا ہوا نظر آئے، جو اُن حقائق کو واضح کرے جن کا واضح ہونا انسانیت کی شدید ضرورت ہے اور وہ کسی انسان کے کلام سے کبھی واضح نہیں ہوئے، جو اُن معاملات میں رہنمائی کرے جن میں رہنمائی کے لیے کوئی دوسرا ذریعہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ ایک ایسا کلام جس کے حق میں وجدان گواہی دے، علم و عقل کے مسلمات جس کی تصدیق کریں، جو ویران دلوں کو اِس طرح سیراب کر دے، جس طرح مردہ زمین کو بارش سیراب کرتی ہے، جس میں وہی شان، وہی حسن بیان، وہی فصاحت و بلاغت اور وہی تاثیر ہو جو قرآن کا پڑھنے والا، اگر اُس کی زبان سے واقف ہو تو اُس کے لفظ لفظ میں محسوس کرتا ہے۔“

(جاوید احمد غامدی، البیان ۴/۲۳۴)

محمد وسیم اختر مفتی

مہاجرین حبشہ

(۳۲)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ

عہد صدیقی

۱۳ھ: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد فتنۂ ارتداد بھڑک اٹھا اور مدعیان نبوت نے پھر سر اٹھایا۔ خلیفۂ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان دونوں فتنوں کا قلع قمع کر کے سکون بحال کر دیا تو یمن کے دوسرے حکام کے ساتھ حضرت ابو موسیٰ اشعری بھی اپنے منصب پر بحال ہو گئے۔ حضرت ابو بکر کی ابتداے خلافت میں وہ یمن کے شہروں مارب، زبید اور رمع کے عامل کے فرائض انجام دیتے رہے۔

عہد فاروقی

۱۵ھ: حضرت مغیرہ بن شعبہ نے نہر تیری اور دست میسان کے باشندگان سے معاہدۂ صلح کیا۔ بعد میں وہ عہد سے پھر گئے تو حضرت ابو موسیٰ نے انھیں زیر کیا (تاریخ خلیفہ ۱۳۱)۔

بصرہ کی گورنری

۱۷ھ: گورنر بصرہ حضرت مغیرہ بن شعبہ پر زنا کی تہمت لگی تو خلیفۂ دوم حضرت عمر نے انھیں معزول کرنے کے بعد حضرت ابو موسیٰ اشعری کو بصرہ کا گورنر بنایا۔ انھوں نے اپنے فرمان میں لکھا: میں ایسی سرزمین کی طرف حاکم بنا کر بھیج رہا ہوں جہاں شیطان نے انڈے دیے ہیں اور ان میں سے چوزے بھی نکل آئے ہیں۔

تم سنت نبوی کی پیروی کرنا اور منحرف نہ ہو جانا۔ اصحاب رسول کی ایک تعداد کا تعاون حاصل کرنا، وہ اس امت میں نمک کے مانند ہیں۔ چنانچہ حضرت ابوموسیٰ نے انیتس صحابہ کو ساتھ لیا، ان میں حضرت انس بن مالک اور حضرت عمران بن حصین شامل تھے۔ حضرت عمر نے اہل بصرہ کو لکھا: میں نے ابوموسیٰ کو تمھارا امیر بنا کر بھیجا ہے تاکہ تمھارے کم زور کو طاقت ور سے حق دلائے اور تمھارے ساتھ مل کر دشمن سے جنگ کرے۔ حضرت مغیرہ نے جاتے وقت حضرت ابوموسیٰ کو طائف کی پروردہ لونڈی عقیلہ ہدیہ کی۔ حضرت عمر نے حضرت مغیرہ کے خلاف گواہی دینے والوں پر جن میں حضرت ابوبکرہ بھی شامل تھے، جرح کی اور ان کی گواہی ثابت نہ ہونے پر حد قذف جاری کی۔

اسی سال حضرت عمر نے حضرت ابوموسیٰ کو بصرہ سے ہٹا کر کوفہ کی گورنری سونپی، پھر واپس بصرہ بھیج دیا۔ انھوں نے ہدایت کی کہ وہ بصرہ کی آخری عمل داری تک پہنچ جائیں اور تا حکم ثانی وہیں مقیم رہیں۔

جنگ شوستر (فتح خوزستان)

۱۷ھ (: طبری، ابن جوزی، ابن اثیر، ابن کثیر)۔ ۲۰ھ (: ذہبی) ایرانی بادشاہ یزدگرد مرو میں تھا۔ اس نے تمام ایرانیوں کو مسلمانوں کے خلاف متحد ہونے کے لیے انگیخت کیا۔ اہل اہواز اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ حضرت عمر کو اطلاع ملی تو انھوں نے گورنر کوفہ حضرت سعد بن ابی وقاص کو حضرت نعمان بن مقرن کی قیادت میں اور گورنر بصرہ حضرت ابوموسیٰ اشعری کو حضرت سہل بن عدی کی سربراہی میں افواج بھیجنے کی ہدایت کی۔ دوسری روایت کے مطابق حضرت عمار بن یاسر نے حلوان سے حضرت جریر بن عبد اللہ کو بھیجا، پھر خود مدینہ سے فوج لے کر آئے۔ ایرانی سپہ سالار ہرمزان نے حضرت نعمان کی فوج کو اربک کے مقام پر روک لیا، لیکن سخت جنگ کے بعد شکست کھائی اور فرار ہو کر شوستر (عربی: تستر) پہنچ گیا۔ اب تمام اسلامی افواج بھی خوزستان کے صدر مقام شوستر میں جمع ہو گئیں، حضرت ابوسبرہ بن ابورہم مشترکہ فوج کے قائد تھے۔ حضرت عمر نے حضرت ابوموسیٰ کو ایک نیا لشکر لے کر خود وہاں پہنچنے کی ہدایت کی۔ اہل شوستر قلعہ بند ہو گئے، کئی ماہ تک ان کا محاصرہ جاری رہا، اس دوران میں انھوں نے باہر نکل کر اسّی حملے کیے۔ مسلمان فوجیوں نے فصیل شہر پھلانگنے کی کوشش کی، لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ محاصرے نے اٹھارہ ماہ تک طول کھینچا۔ آخر کار سینبہ نامی ایک ایرانی نے ایک تیر میں یہ تحریر پرو کر حضرت ابوموسیٰ کے لشکر میں پھینکی: مجھے پناہ دے دیں تو میں آپ کو شہر میں داخل ہونے کا راستہ بتا دیتا ہوں۔ اس نے شہر کا پانی خارج ہونے کے راستے سے اندر داخل ہونے کا مشورہ

دیا۔ دوسری روایت کے مطابق اس نے کہا: جس نہری راستے کے ذریعے سے دریاے دجیل سے شہر کو پانی سپلائی کیا جاتا ہے، وہاں سے شہر میں گھسا جا سکتا ہے۔ حضرت ابوموسیٰ نے حضرت مجزاہ بن ثور کی قیادت میں چالیس کمانڈو اور دو سو جوان بھیجے۔ ظلمت شب میں انھوں نے پہرے داروں کو قتل کر کے فصیل پر قبضہ کر لیا۔ دروازے کھل گئے اور جیش اسلامی اندر داخل ہو گیا۔ ہرمزان نے اپنے آپ کو حوالے کرنے کے لیے شرط لگائی کہ عمر خود اس کے بارے میں فیصلہ کریں۔ حضرت ابوموسیٰ نے خمس مدینہ بھیجا، ان کے حکم پر حضرت انس بن مالک اور احنف بن قیس ہرمزان کو باندھ کر حضرت عمر کی خدمت میں لے گئے، بارہ عجمی بھی ساتھ تھے۔ حضرت عمر نے ہدایت کی کہ اس کی تعظیم کرو اور اچھے لباس میں مدینہ لانا۔ حضرت انس بن مالک کہتے ہیں: شوستر کی فتح کے وقت ہم فجر کی نماز ادا نہ کر سکے۔ فتح مکمل ہونے کے بعد ہم نے ابوموسیٰ کی امامت میں دن چڑھے یہ نماز پڑھی۔ مجھے دنیا و مافیہا کی خوشیوں نے اس نماز سے بڑھ کر مسرت نہیں دی (بخاری، الصلاۃ عند مناهضة الحصون ولقاء العدو)۔

فتح سوس

۱۷ھ: حضرت ابوسبرہ بن ابورہم شوستر کے شکست خوردوں کا تعاقب کرتے ہوئے سوس پہنچے اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ حضرت نعمان بن مقرن اور حضرت ابوموسیٰ اشعری بھی ان کے ساتھ تھے۔ اہل سوس کو جنگ جلولا میں شکست کی خبر ملی اور معلوم ہوا کہ شاہ یزدگرد شکست کھا کر اصطخر چلا گیا ہے تو انھوں نے حضرت ابوموسیٰ اشعری سے صلح کی درخواست کی۔ ان کے سپہ سالار سیاہ نے سرداروں سے مشورہ کر کے شیرویہ اور دس جرنیلوں کو حضرت ابوموسیٰ کے پاس بھیجا۔ انھوں نے کہا: ہم اس شرط پر اسلام قبول کرتے ہیں کہ ہم آپ کے ساتھ مل کر اہل عجم سے جنگ کریں گے اور اگر اہل عرب میں سے کوئی ہمارے ساتھ جنگ کرے تو آپ ہماری مدد کریں گے۔ حضرت ابوموسیٰ نے کہا: تمھیں وہ حقوق حاصل ہوں گے جو ہمیں حاصل ہیں اور تمھارے فرائض وہی ہوں گے جو ہمارے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا: ہم اس پر راضی نہیں۔ حضرت ابوموسیٰ نے حضرت عمر کو خط لکھا تو انھوں نے ان کے مطالبات ماننے کا مشورہ دیا۔ معاہدہ تحریر کرنے کے بعد وہ سوس کے محاصرے میں شریک ہوئے۔ ان میں سرگرمی اور جوش و خروش نہ دیکھ کر حضرت ابوموسیٰ نے اعتراض کیا تو سیاہ نے کہا: ہم اس مذہب میں تمھاری طرح نہیں، تم نے ہمیں بڑے عطیات بھی نہیں دیے۔ حضرت عمر نے مشورہ دیا: ان کی بہادری کے مطابق وظائف مقرر کرو۔ ان کے سو افراد کو دو دو ہزار اور ان چھ افراد کو اڑھائی اڑھائی ہزار کے

عطیات جاری کرو: سیاہ، خسرو، شہریار، شہرویہ، شیرویہ اور افرودین۔ ایک روایت کے مطابق سیاہ نے عجمی لباس پہن کر کپڑوں پر خون لگایااور شہر کے دروازے کے آگے لیٹ گیا۔ ایرانیوں نے اپنا آدمی دیکھ کر دروازہ کھولا تو تمام مسلمان اندر داخل ہو گئے۔ دوسری روایت کے مطابق حضرت نعمان کی سپاہ میں شامل صاف بن صیاد نے حالت غضب میں شہر کے دروازے پر لات ماری اور چلا کر کہا: کھل جا تو دروازہ کھل گیا۔

ہتھیار ڈالنے کے وقت دہقان سوس نے حضرت ابو موسیٰ سے اپنے سو اہل خانہ کی جان بخشی کا وعدہ لیا تھا، شومئ قسمت کہ اپنا نام لینے کا اسے خیال نہ رہا۔ حضرت ابو موسیٰ نے اس کی گردن اڑانے کا حکم دے دیا۔ شہر فتح کرنے کے بعد معلوم ہوا، یہاں پر اللہ کے نبی حضرت دانیال کی قبر ہے۔ ان کا جسد کھلا نظر آتا ہے، ان کے گھٹنے سر سے ملے ہوئے ہیں۔ لوگ ان سے بارش کی دعائیں مانگتے ہیں۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری نے حضرت عمر کو مطلع کیا کہ میت کے ساتھ ایک مصحف اور ایک گھڑا بھی ہے، جس میں کچھ چربی، درہم اور ایک انگوٹھی پڑی ہے حضرت عمر نے جثۂ مبارک کی تکفین و تدفین کر کے قبر بند کرنے کا حکم دیا۔ مصحف اور کچھ چربی مدینہ بھیجنے اور باقی چربی اور درہم مسلمانوں میں تقسیم کرنے کو کہا۔ انگوٹھی کے بارے میں لکھا کہ وہ ہم نے تمھیں دے دی، اسے مہر کے طور پر استعمال کرو۔ حضرت دانیال کی قبر آج بھی موجود ہے، انیسویں صدی میں اس پر مزار تعمیر کیا گیا۔ دوسری روایت کے مطابق ان کی جائے تدفین کو مخفی رکھا گیا اور حضرت ابو موسیٰ کے سوا اسے کوئی نہ جانتا تھا۔

حضرت عمر نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کو بصرہ لوٹنے کی ہدایت کی، اس طرح انھیں تیسری بار بصرہ کی حکومت ملی۔

طاعون عمواس

۱۷ھ: (۱۸ھ: ابن اسحاق) فلسطین کی بستی عمواس میں طاعون پھیلا تو حضرت ابو موسیٰ اشعری نے رائے دی: اس بات میں کوئی مضائقہ نہیں کہ تم اس بستی سے چلے جاؤ اور اپنے ملک کے کھلے اور صاف مقام میں رہو تاآنکہ یہ وبا ختم ہو جائے۔ البتہ یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ اگر انسان یہاں نہ ہوتا تو اسے یہ بیماری نہ لگتی۔ حضرت عمر نے حضرت ابو عبیدہ بن جراح کو ہدایت کی کہ مسلمانوں کو طاعون کی سرزمین سے دور لے جاؤ۔ انھوں نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کو بلا کر کہا: مسلمانوں کے لیے ٹھکانا ڈھونڈو۔ اس اثنا میں حضرت ابو عبیدہ اور ان کی اہلیہ طاعون کا شکار ہو گئے اور حضرت ابو موسیٰ فوج کو جابیہ لے آئے۔ ابن اثیر کہتے ہیں: حضرت ابو موسیٰ اس وقت

بصرہ میں تھے۔

۱۷ھ: (ابن اسحاق: ۱۹ھ): گورنر کوفہ حضرت سعد بن ابی وقاص نے حضرت عیاض بن غنم کو الجزیرہ کی مہم پر بھیجا اور حضرت ابو موسیٰ اشعری اور اپنے بیٹے حضرت عمر بن سعد کو ان کے ساتھ روانہ کیا۔ حضرت عیاض نے حضرت ابو موسیٰ کو نصیبین بھیجا، پھر خود وہاں پہنچے اور دونوں نے نصیبین اور حران فتح کیے۔ ابن اثیر کہتے ہیں: حضرت عیاض نے دارا فتح کیا، جب کہ ابن جوزی حضرت سعد کو فاتح قرار دیتے ہیں۔

حضرت عیاض کی وفات کے بعد حضرت عمر نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کو راس عین بھیجا۔

۱۸ھ: حضرت ابو موسیٰ اشعری نے سرق، رامہرمز، رہا اور سمیساط کے شہر فتح کیے۔ شہرک کے قتل ہونے کے بعد کمانڈر برتیان توجان میں قلعہ بند ہو گیا تو حضرت ابو موسیٰ نے ایک سال تک اس کا محاصرہ کیا۔ حضرت عمر نے اسے نکل کر کہیں اور چلے جانے کا اختیار دیا تو وہ اصطخر چلا گیا۔

عام الرمادہ

۱۸ھ: مدینہ میں اس سال قحط پڑا تو ہر طرف خاک اڑتی نظر آتی، اس لیے اسے خاک (رمادہ) اڑنے والا سال کہا گیا۔ حضرت عمر بن خطاب نے گورنر حضرت ابو موسیٰ کو خط لکھا کہ بھوک کی وجہ سے عرب ہلاک ہو رہے ہیں، غلہ بھیجو۔ حضرت ابو موسیٰ نے غلہ بھیجا اور خط لکھا: امیر المومنین، اگر مناسب سمجھیں تو مختلف شہروں کے لوگوں کو ہدایت کریں کہ ایک دن باہر نکل کر جمع ہوں اور بارش کی دعا کریں۔ حضرت عمر نے یہ ہدایت لکھ بھیجی۔ حضرت ابو موسیٰ بھی نکلے، بارش کی دعا کی اور نماز نہ پڑھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز استسقا اور دعاے استسقا، دونوں ثابت ہیں۔ جب بھی بارش ہوتی تو حضرت ابو موسیٰ بارش میں کھڑے ہو کر نہاتے۔

فتح اصفہان

۲۱ھ: حضرت عمر نے ایرانی فوجوں کا ہر جگہ تعاقب کرنے اور شاہ ایران کو ایران سے نکالنے کا فیصلہ کیا، کیونکہ وہ ہر سال نئی جنگ کی تیاری کرتا تھا۔ انھوں نے امیر کوفہ حضرت عمار بن یاسر کو اصفہان جانے اور حضرت ابو موسیٰ اشعری کو ان کی معاونت کرنے کا حکم دیا۔ حضرت عبد اللہ بن ورقا ہراول دستے پر مامور ہوئے۔ اصفہان کے ایک ضلع میں گھمسان کی جنگ ہوئی، ایرانی فوج کے بوڑھے سردار شہر براز جاذویہ نے دعوت مبارزت دی تو حضرت عبد اللہ بن ورقا نے آگے بڑھ کر اسے جہنم رسید کیا۔ اس کے بعد حاکم ضلع استندار نے صلح کر لی۔ اب اسلامی فوج جیّ کے مقام پر پہنچی، یہ وہی قصبہ ہے جہاں حضرت سلمان فارسی پیدا

ہوئے تھے۔ شاہ اصفہان فاذوسفان نے دو بدو مقابلے کے لیے کہا، لیکن پھر جزیہ ادا کر کے صلح کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ تیس شہریوں نے جزیہ ادا کرنے کے بجائے کرمان جانے کو ترجیح دی۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری صلح ہو جانے کے بعد جیؔ پہنچے تھے۔ معاہدۂ صلح لکھا گیا تو انھوں نے حضرت عبداللہ بن ورقا اور عصمت بن عبداللہ کے ساتھ گواہی ثبت کی۔ جنگ اصفہان میں ایک صحابی حضرت حممہ نے دعا کی: اے اللہ، میں تیری راہ میں شہید ہونا چاہتا ہوں، اگر میں سچا ہوں تو مجھے عزم عطا کر، میں اس سفر میں واپس نہ لوٹوں۔ وہ شہید ہو گئے تو حضرت ابوموسیٰ نے کھڑے ہو کر خطاب کیا: سنو، ہم نے اپنے نبی کے جوار شادات سنے اور جو ہمارا علم بتاتا ہے، حممہ شہید ہیں۔

فتح الفتوح، فتح نہاوند

۲۱ھ: سیدنا عمر کو بہت تجسس تھا، ایرانی مسلمانوں سے کیے ہوئے معاہدات کا پاس کیوں نہیں کرتے؟ بار بار ان کی طرف سے عہد شکنی کیوں ہوتی ہے؟ احنف بن قیس نے کہا: آپ نے ہمیں ملک ایران میں مزید پیش قدمی سے روک رکھا ہے، جب کہ ایرانی بادشاہ یزدگرد اپنی قوم میں موجود ہے اور انھیں ہمارے خلاف اکساتا رہتا ہے۔ آپ اجازت دیں، ہم آگے بڑھ کر اس کا رہا سہا اقتدار بھی ختم کر ڈالیں۔ ایرانیوں کو کسی جانب سے امید نہ رہے گی تب ہی ان کا جوش مزاحمت سرد پڑے گا۔ ادھر نہاوند میں اکٹھے ہونے والے ایرانی سردار جو اپنی پے در پے شکستوں کے اسباب پر غور کر رہے تھے، اس نتیجے پر پہنچے کہ ایران کی مرکزی حاکمیت کم زور ہونے سے اس کی افواج بھی کم زور پڑ گئی ہیں۔ سب نے مل کر یزدگرد کو دعوت دی کہ وہ ایران کی شاہی روایات کا امین ہونے کی وجہ سے اپنی افواج کی قیادت خود کرے۔ اس نے ایران کے گوشے گوشے میں موجود فوجی قوت نہاوند منتقل کرنے کی ہدایت کی۔ اس طرح فیرزان کی قیادت میں پندرہ لاکھ کی فوج نہاوند میں اکٹھی ہو گئی۔ اب خلیفۂ ثانی کے لیے ممکن نہ تھا کہ پیش قدمی سے گریز کرنے کی پالیسی برقرار رکھتے، انھوں نے فتوحات عجم کو وسعت دینے کا فیصلہ کر لیا۔

حضرت عمر نے نماز پڑھانے کے بعد لوگوں سے مشورہ کیا: کیا میں خود قیادت کرتے ہوئے اسلامی فوج عراق لے جاؤں؟ حضرت علی نے کہا: آپ نے اسلامی سلطنت کو ایک لڑی میں پرو رکھا ہے۔ عجمی آپ کو میدان جنگ میں پا کر ختم کرنے کی کوشش کریں گے، اگر یہ لڑی بکھر گئی تو دوبارہ کبھی اکٹھی نہ ہو سکے گی۔ آپ اہل کوفہ کو خط لکھیں، وہ اس مہم میں شریک ہوں اور اہل بصرہ ان کے ساتھ تعاون کریں۔ مزید مشاورت کے بعد حضرت نعمان بن مقرنؔ کو کمانڈر مقرر کرنے کا فیصلہ ہوا۔ حضرت عمر نے انھیں فوج لے کر ماہ کی طرف جانے کا حکم

دیا۔ انھوں نے حضرت عبداللہ بن عتبان کو خط لکھا کہ ماہ میں نعمان کے ساتھ جا ملیں اور ان کی مشترکہ فوج نہاوند کو کوچ کرے۔ امیر المومنین نے حضرت نعمان کی شہادت کی صورت میں حضرت حذیفہ بن یمان اور ان کے بعد حضرت نُعیم بن مقرّن کو کمان لینے کا حکم دیا۔ انھوں نے حضرت ابو موسیٰ اشعری، سلمی بن قین اور حرملہ بن ریطہ کو ہدایت بھیجی کہ فیرزان کو کمک پہنچنے میں رکاوٹ پیدا کریں اور بصرہ کی افواج لے کر آئیں۔ معرکۂ نہاوند میں مسلمانوں کو عظیم الشان فتح حاصل ہوئی، جسے فتح الفتوح کہا جاتا ہے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری جنگ نہاوند میں مصروف اسلامی فوج کو مدد فراہم کرنے کے بعد دینور پہنچے۔ پانچ دن کے قیام کے دوران میں انھوں نے جزیہ ادا کرنے کی شرط پر وہاں کے باشندگان سے صلح کی، پھر اسی طرح اہل سیروان سے صلح نامہ تحریر کیا۔ انھوں نے حضرت سائب بن اقرع کو صیمرہ بھیجا، جنھوں نے مہرجان قذق سے انھی شرائط پر صلح کی۔

۲۱ھ: اس سال حضرت ابو موسیٰ اشعری نے قم اور قاشان فتح کیے (ابن کثیر)۔

۲۲ھ (۶۳۴ء): کوفہ کے لوگوں نے اپنے گورنر حضرت عمار بن یاسر پر عدم اطمینان کا اظہار کیا تو حضرت عمر نے انھیں مدینہ طلب کیا۔ حضرت عمار کے ساتھ جانے والے کوفہ کے وفد نے بھی ان کے طرز حکومت پر تنقید کی۔ حضرت عمر نے حضرت عمار کو معزول کرنے کے بعد اہل کوفہ سے مشورہ لیا: تم کسے حاکم بنانا چاہتے ہو؟ انھوں نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کا نام لیا۔ حضرت عمر نے ان کی تقرری کر دی، وہ ایک سال اس عہدے پر فائز رہے، لیکن اہل کوفہ نے ان کے خلاف بھی شکایتیں کرنا شروع کر دیں کہ ان کا غلام تجارت کرتا ہے تو حضرت عمر نے انھیں ہٹا کر واپس بصرہ کی گورنری پر فائز کر دیا اور حضرت مغیرہ بن شعبہ کو کوفہ کا گورنر بنا دیا۔

۲۲ھ: حضرت ابو موسیٰ یا حضرت سائب بن اقرع نے ماہ دینار فتح کیا۔

۲۳ھ (طبری، ابن جوزی، ابن اثیر، ابن کثیر)۔ ۲۱ھ (ذہبی): اس سال حضرت عثمان بن ابوالعاص نے اصطخر فتح کیا، لیکن خلافت فاروقی کے آخری زمانے میں ایرانی کمانڈر شہرک نے بغاوت کر دی۔ حضرت عثمان بن ابوالعاص دوبارہ آئے، شہرک کو موت کے گھاٹ اتار کر بغاوت فرو کی اور حضرت عمر کو خط لکھا: میرے اور کوفہ کے بیچ کھلا راستہ ہے، مجھے اندیشہ ہے کہ دشمن وہاں سے در آئے گا، ایسا ہی خط حاکم کوفہ نے بھی لکھا۔ تب حضرت عمر نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کی قیادت میں سات سو کی سپاہ متعین کی اور اسے بصرہ میں مقیم رکھا۔

۲۳ھ: اسلامی فوجیں ایران میں برسرپیکار تھیں کہ خوزستان کے دوسرے دار السلطنت اہواز کے مقام

بیروذ میں کردوں اور دیگر ایرانیوں کا ایک بڑا لشکر جمع ہو گیا۔ حضرت عمر نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کو وہاں پہنچنے کی ہدایت کی۔ نہر تیری اور مناذر کے درمیان ان کا دشمنوں سے مقابلہ ہوا۔ حضرت مہاجر بن زیاد جاں فشانی سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ بھاری جانی نقصان اٹھا کر دشمن محصور ہو گیا تو حضرت ابو موسیٰ نے حضرت مہاجر کے بھائی حضرت ربیع بن زیاد کو کمانڈر مقرر کیا اور اصفہان چلے آئے۔

الزامات اور ان سے بریت

حضرت ابو موسیٰ اشعری نے بیروذ کی فتح کے بعد مال غنیمت اور جنگی قیدیوں کو اکٹھا کیا اور فتح کی خبر مدینہ بھیجنے کے لیے ایک وفد تیار کیا۔ اتنے میں قبیلہ عنزہ کا ایک شخص ضبہ بن محصن آیا اور کہا: میرا نام وفد میں لکھ لیں۔ حضرت ابو موسیٰ نے کہا: ہم نے تم سے زیادہ حق دار افراد شامل کیے ہیں۔ وہ ناراض ہو کر شکایت کرنے حضرت عمر کے پاس پہنچ گیا اور حسب ذیل شکایتیں پیش کیں: ۱۔ حضرت ابو موسیٰ نے اسیران جنگ میں سے ساٹھ رئیس زادے چھانٹ کر اپنے لیے رکھے ہیں۔ ۲۔ انھوں نے ناپنے کے دو پیمانے رکھے ہیں۔ ۳۔ انھوں نے عنان حکومت زیاد بن سمیہ کے سپرد کر دی ہے اور وہی سیاہ و سپید کا مالک ہے۔ ۴۔ انھوں نے شاعر حطیہ کو ایک ہزار انعام دیا ہے۔ وہ اپنی لونڈی عقیلہ کو دن میں دو پیالے بھر کر عمدہ غذائیں بہم پہنچاتے ہیں۔

حضرت عمر نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کو بلا کر تفتیش کی تو انھوں نے عنزی کے الزاموں کا جواب دیتے ہوئے بتایا: ساٹھ غلاموں کا زر فدیہ مقرر تھا جو مسلمانوں میں تقسیم کیا گیا۔ ناپنے کا ایک قفیز میرے اہل و عیال کے لیے ہے اور دوسرا مسلمانوں میں رزق تقسیم کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ زیاد بن سمیہ شریف اور عقل مند ہے، اس لیے میں نے اپنے کام اس کے سپرد کیے۔ شاعر حطیہ کا میں نے اپنے ذاتی مال سے منہ بند کیا تاکہ وہ مجھے گالی نہ دینے پائے۔ لونڈی عقیلہ کی خوش خوراکی کا انھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ حضرت عمر نے حضرت ابو موسیٰ کو معمولی فہمایش کے بعد بری قرار دیا اور اپنے منصب پر واپس بھیج دیا۔

اصفہان کی دوسری جنگ

۲۳ھ: حضرت ابو موسیٰ اشعری حضرت عمر کے حکم پر فوج لے کر اصفہان پہنچے اور لوگوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ وہ نہ مانے تو جزیہ ادا کر کے صلح کرنے کی پیشکش کی۔ اہل اصفہان نے صلح کر لی، مگر اگلے روز مکر گئے۔ تب حضرت ابو موسیٰ نے حملہ کر دیا اور جلد فتح پا لی۔ حضرت عمر نے ان کو اصفہان کی عمل داری بھی دی۔ اس سال حضرت ابو موسیٰ اشعری بصرہ کے گورنر رہے۔ انھیں گورنری سے ہٹایا گیا تو ان کے پاس

صرف چھ سو درہم تھے جو ان کے اہل و عیال کو ملنے والا وظیفہ تھا۔

حضرت عمر نے حضرت ابو موسیٰ کو جاگیر دی۔

نہر ابو موسیٰ کی تعمیر

عرب فوجیوں کو عجم کی آب و ہوا موافق نہ آئی تو حضرت عمر کے حکم پر دجلہ و فرات کے ڈیلٹا میں بصرہ کا نیا شہر بسایا گیا۔ حضرت عمر نے شہر کا نقشہ خود تجویز کیا، جب کچی اینٹوں کے سات محلے بن گئے تو انھوں نے حضرت عتبہ بن غزوان کو شہریوں کی پانی کی ضروریات پورا کرنے کے لیے دریاے فرات سے بصرہ تک نہر بنانے کا حکم دیا۔ پھر جب انھوں نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کو شہر کا پہلا گورنر مقرر کیا تو انھیں دریاے دجلہ سے دوسری نہر بصرہ تک لانے کی ہدایت کی۔ حضرت ابو موسیٰ نے خود مستعد ہو کر چھ میل لمبی نہر کھدوائی جو نہر ابو موسیٰ کے نام سے مشہور ہے۔ عہد اموی میں ان دونوں نہروں کی سیرابی سے بنجر زمین کا ایک بڑا رقبہ شاداب ہو گیا۔

حضرت عمر کی شہادت کے وقت حضرت ابو موسیٰ اشعری بصرہ میں نماز پڑھانے پر مامور تھے۔ حضرت عمر نے اپنی وصیت میں لکھا کہ کسی عامل کو ایک سال سے زیادہ برقرار نہ رکھا جائے، تاہم حضرت ابو موسیٰ چار سال عامل رہے (احمد، رقم ۱۹۴۹۰)۔

حضرت عمر کی خاص ہدایات

حضرت ابو موسیٰ شام میں تھے کہ حضرت عمر نے انھیں بلا بھیجا اور کہا: میں نے تمھیں ایک خیر کے لیے بلایا ہے کہ تم میری خواہش کو اپنی خواہش پر ترجیح دو۔ تمھاری خواہش اللہ کی راہ میں جہاد کرنا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تمھیں بصرہ بھیجوں اور تم وہاں کے لوگوں کو اپنے رب کی کتاب اور اپنے نبی کی سنت کی تعلیم دو اور ان کے دشمنوں سے جہاد کر کے مال غنیمت ان میں تقسیم کرو۔ حسن بصری کہتے ہیں: حضرت ابو موسیٰ نے بصرہ والوں کو اپنے رب کی کتاب اور اپنے نبی کی سنت کی تعلیم دی اور ان کے دشمنوں سے جہاد کر کے مال غنیمت ان میں تقسیم کیا: واللہ، بصرہ والوں کے حق میں حضرت ابو موسیٰ سے بہتر شہ سوار نہیں آیا (مستدرک حاکم، رقم ۵۹۶۲)۔ حضرت ابو موسیٰ بصرہ کی مسجد میں بیٹھ جاتے اور اپنے سامنے لوگوں کی صفیں بنوا کر قرآن مجید پڑھاتے۔ لوگ ایسے منہمک ہوتے کہ رفع حاجات بھی بھول جاتے۔

حضرت عمر نے حضرت ابو موسیٰ کو نصیحت کی: قضا بڑا فریضہ ہے۔ کم زور کو اپنے عدل سے مایوس نہ ہونے

دینا، طاقت ور کو اپنے اختیار سے فائدہ نہ اٹھانے دینا۔ مدعی کو مہلت دینا کہ وہ اپنی گواہی پیش کر سکے۔ جس مسلمان پر کوئی حد نہ لگی ہو یا وہ جھوٹی گواہی کا مرتکب نہ ہوا ہو تو اسے عادل سمجھنا۔ ملتے جلتے قضیوں میں قیاس کرنا۔ صلح بہتر ہے، بشرطیکہ وہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال نہ کر دے۔ کوئی فیصلہ کرنے کے بعد اس کی غلطی واضح ہو جائے تو حق کو اختیار کرنے سے نہ ہچکچانا۔ غصہ نہ کرنا، صبر سے کام لینا اور لوگوں کو ایذا نہ دینا۔ قضا سے بڑا اجر و ثواب کمایا جا سکتا ہے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری نے حضرت عمر کی اہلیہ حضرت عاتکہ بنت زید کو تحفے میں ایک غالیچہ بھیجا۔ حضرت عمر نے پوچھا: یہ کہاں سے آیا؟ حضرت عمر نے غالیچہ اہلیہ کے سر پر دے مارا، حتیٰ کہ سر سے دھول اڑنے لگی، پھر پکارے: ابوموسیٰ کو پکڑ کر لاؤ۔ انھیں کھینچ کر لایا گیا تو کہا: تمھیں کیسے ہمت ہوئی کہ میری بیویوں کو تحائف دو۔ غالیچہ ان کے سر پر مار کر کہا: لے جاؤ، ہمیں اس کی حاجت نہیں۔

ایک بار حضرت ابوموسیٰ نے حضرت عمر کو خط لکھا: کاتب نے 'من ابی موسیٰ' کے بجاے 'من ابو موسیٰ' لکھ دیا۔ حضرت عمر نے جواب دیا: کاتب کو ایک درہ لگاؤ اور اس کی جگہ نیا کاتب رکھ لو۔

ایک اہم اور مفید مشورہ

حضرت ابوموسیٰ اشعری نے حضرت عمر کو لکھا: آپ کی طرف سے جو خط آتے ہیں، ان کے وقت تحریر اور تاریخ کا پتا نہیں چلتا۔ حضرت عمر نے صحابہ سے مشورہ کیا تو کسی نے کہا: بعثت نبوی سے تاریخ شروع کر لیں، کسی نے آپ کی وفات سے کیلنڈر شروع کرنے کا مشورہ دیا، لیکن حضرت عمر نے کہا: میں ہجرت نبوی سے اسلامی سال کا آغاز کروں گا، کیونکہ ہجرت نے حق و باطل میں تمیز کر دی۔

حج تمتع کا فتویٰ

عہد فاروقی میں حضرت ابوموسیٰ عمرے کا احرام کھول کر حج تمتع کرنے کا فتویٰ دیا کرتے تھے، لیکن جب ایک شخص نے انھیں یہ کہہ کر منع کیا کہ عمر نے اس بارے میں نئی راے اختیار کر لی ہے تو انھوں نے اعلان کیا: لوگو، تامل کرو، امیر المومنین آنے والے ہیں، ان کی پیروی کرو۔ حضرت عمر نے کہا: اگر ہم کتاب اللہ پر عمل کریں تو وہ ہمیں حج و عمرہ مکمل کرنے کا حکم دیتی ہے اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی کریں تو آپ نے بھی ہدی ذبح ہونے تک احرام نہ کھولا تھا۔ اگر تمتع کی اجازت دے دی جائے تو تمام مسلمان حج کرنے آئیں گے تو تازہ غسل کرنے کی وجہ سے ان کے سروں سے پانی ٹپک رہا ہو گا (بخاری، رقم ۱۵۵۹۔ مسلم، رقم ۲۹۶۱۔

نسائی، رقم ۲۷۴۳۔ ابن ماجہ، رقم ۲۹۷۹۔ احمد، رقم ۱۹۶۷۱)۔

عہد عثمانی

۲۴ھ: حضرت عثمان نے خلافت سنبھالنے کے بعد حضرت ابوموسیٰ اشعری کو بصرہ کی گورنری پر برقرار رکھا۔ وہ نماز پڑھاتے اور قاضی کے فرائض انجام دیتے۔ جب وہ کسی معرکے پر جاتے تو حضرت عمران بن حصین یا زیاد بن سمیہ کو اپنا قائم مقام مقرر کرتے۔ حضرت عثمان نے حضرت ابوموسیٰ کو بصرہ کے قاضی کی ذمہ داریاں بھی سونپیں۔

۲۴ھ: اہل رے نے حضرت حذیفہ بن یمان اور حضرت سوید بن مقرن کے ساتھ کیے ہوئے معاہدۂ صلح کی خلاف ورزی کی تو حضرت ابوموسیٰ اشعری (دوسری روایت: حضرت قرظہ بن کعب) نے رے کو دوبارہ زیر کیا (ابن کثیر)۔

۲۷ھ: حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت عثمان بن ابوالعاص نے ارّجان اور دارابجرد کے باشندگان سے جزیہ وصول کرنے کی شرط پر معاہدات صلح کیے۔

۲۹ھ: چار سال (دوسری روایت: تین سال) بصرہ کی گورنری کرنے کے بعد حضرت عثمان نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کو ہٹا کر عبداللہ بن عامر کو بصرہ کا حاکم مقرر کیا۔ غیلان بن خرشہ ضبی نے ان سے کہا تھا کہ کیا آپ کے پاس کوئی جوان نہیں، یہ بوڑھے ابوموسیٰ کب تک بصرہ کے حاکم رہیں گے؟ عبداللہ بن عامر حضرت عثمان کے ماموں زاد تھے اور ان کی عمر پچیس سال تھی۔ حضرت ابوموسیٰ نے کہا: تمھارے اوپر قریش کا ایک نوجوان آیا ہے، جس کی مائیں، پھوپھیاں اور خالائیں بڑے حسب نسب والی ہیں۔ مال کے ذریعے سے تم پر ایسے ویسے حکم لگائے گا۔ حضرت ابوموسیٰ چالیس خچروں پر گھر کا ساز و سامان لاد کر محل سے نکلے تو لوگوں نے ان کی باگ تھام لی اور کہا: یہ فالتو سامان ہمیں اٹھوا دیں اور خود پیدل چلیں، جیسے ہمیں پیدل جہاد کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔ انھوں نے اپنا کوڑا گھمایا تو لوگوں نے راستہ دیا۔

۳۴ھ: بنو ہمدان کے یزید بن قیس ارحبی نے جمل، صفین اور نہروان کی جنگوں میں حضرت علی کا ساتھ دیا تھا۔ حضرت علی نے اسے رے، ہمدان اور اصفہان کا گورنر بھی مقرر کیا تھا۔ ۳۴ھ میں وہ کوفہ کی مسجد میں بیٹھ گیا اور حضرت عثمان کی حکومت کے خلاف سازشیں کرنے لگا۔ حضرت قعقاع نے اس کی گرفت کی تو بولا: ہم سعید بن العاص کو کوفہ کی گورنری سے ہٹانا چاہتے ہیں۔ حضرت سعید بن العاص حضرت عثمان سے ملاقات کر کے

مدینہ سے واپس آئے تو اشتر کی سپاہ نے انھیں کوفہ میں داخل نہ ہونے دیا۔ یزید بن قیس عارضی امیر بنا، پھر حضرت عثمان نے اہل کوفہ کا مطالبہ مانتے ہوئے حضرت ابوموسیٰ اشعری کو کوفہ کا گورنر مقرر کر دیا۔ حضرت ابوموسیٰ نے کوفہ پہنچ کر خطاب کیا: لوگو، اپنی جماعت سے جڑے رہو، اطاعت کرو، جلد بازی نہ کرو اور صبر سے کام لو۔ انھوں نے حاضرین سے حضرت عثمان کے لیے سمع و طاعت کا عہد لیا۔

[باقی]

محمد ذکوان ندوی

زوالِ آدمِ خاکی

ایک انٹر نیشنل اسکول کے ''اسپورٹس ڈے'' میں شرکت کا موقع ملا۔ اسکول کی طرف سے میرے بچے ابراہیم نے بھی اِس مقابلے میں حصہ لیا۔ اِس پروگرام میں طلبہ کے والدین بھی ناظرین کی حیثیت سے شریک تھے۔ طلبہ جب میدان مقابلہ میں اترے، اُس وقت ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ننھے فرشتے آسمان سے اتر کر اسکول کے وسیع سبزہ زار میں دور تک صف بستہ کھڑے ہو گئے ہوں۔ ''بچے جنت کے پھول ہیں'' یہ منظر اِس قول کا ایک انتہائی حسین نمونہ پیش کر رہا تھا۔

اِن معصوم بچوں کو دیکھ کر دل بھر آیا اور بے تابانہ انداز میں زبان پر یہ دعا جاری ہو گئی ------ خدایا، ہم بے مایہ و کم زور ہیں، ہم اِن بچوں کی تربیت کا نازک کام نہیں کر سکتے۔ تو قادر مطلق اور 'فعّالٌ لما یرید' ہے۔ تو اِن کا تزکیہ و تربیت کر، تو اِنھیں اپنے سچے بندوں میں شامل فرما۔

اِس کے بعد طلبہ کے متعلق سوچتے ہوئے یہ خیال آیا کہ کیا طلبہ اور والدین کا معاملہ دو الگ الگ افراد کا معاملہ ہے؟ غور کرنے سے معلوم ہوا کہ نہیں، طلبہ اور والدین کی کامیابی اور ناکامی دو الگ الگ افراد کی کامیابی اور ناکامی ہرگز نہیں، دونوں کا معاملہ ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم جیسا ہے۔ دونوں کی کامیابی اور ناکامی گویا ایک ہی فرد کی کامیابی اور ناکامی کے ہم معنی ہے۔

ایک شخص اگر اِس معاملے پر غور کرے تو اِس میں خدا کی دریافت کا ایک عجیب راز چھپا ہوا ہے۔ اگر وہ اِس راز کو دریافت کر سکے تو اُس کے اندر دعا کا ایک طوفانی سیلاب اُمڈ آئے گا۔ وہ خدا سے پورے عجز و نیاز کے ساتھ کہے گا کہ خدایا، جب ماں اور بچے کی کامیابی اور ناکامی کا معاملہ ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتا تو پھر تو جو میرا اور تمام ماؤں کا خالق اور مالک ہے، اُس کا معاملہ اپنے اِس بندے سے الگ کیسے ہو گا؟ خدایا، کیا تو دنیا اور آخرت

میں ہماری ناکامی کا تحمل کر سکتا ہے؟ خدایا، کیا جب تیرے فرشتے تیرے اِس بندے کو اُس کی بے عملی اور نافرمانی کے سبب ابدی جہنم کے حوالے کر رہے ہوں گے، تو کیا تو اُس وقت اپنے اِس بندے کے معاملے سے غیر متعلق (indifferent) ہو کر چین سے بیٹھا یہ منظر دیکھتا رہے گا؟ خدایا، کیا اپنے اِس بندے کو جہنم کے بھڑکتے شعلوں کے درمیان دیکھ کر تو مجھ پر رحم نہیں فرمائے گا؟ خدایا، مجھے جہنم کی پستیوں میں بھٹکتا دیکھ کر تجھے عرش معلیٰ پر چین کس طرح آسکتا ہے؟ خدایا، تو اپنے اِس بندے کے معاملے میں کس طرح غیر جانب دار ہو سکے گا!؟

اِس طوفانی کیفیت کے دوران میں عجز و نیاز پر مبنی اقبال کے یہ کلمات میری زبان پر جاری ہو گئے:

اگر کج رو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا
اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لا مکاں خالی
خطا کس کی ہے یارب، لا مکاں تیرا ہے یا میرا
اُسے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیوں کر؟[1]
مجھے معلوم کیا، وہ رازداں تیرا ہے یا میرا
محمد بھی ترا، جبریل بھی، قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں، تیرا ہے یا میرا
اِسی کوکب[2] کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوالِ آدمِ خاکی، زیاں تیرا ہے یا میرا

(بالِ جبریل)

جہنم کس کے لیے؟

اِس معاملے پر غور کرتے ہوئے سمجھ میں آیا کہ جہنم کا عذاب صرف اُنھی لوگوں کے لیے مقدر ہے جو خدا کے خلاف سرکشی کا طریقہ اختیار کریں۔ جو اپنی کوتاہیوں پر نادم نہ ہوں، بلکہ نخوت اور رعونت میں مبتلا ہو کر

۱۔ ابلیس۔

۲۔ انسان۔

سعادت کے بجائے خود اپنے لیے بد بختی کے راستے کا انتخاب کر لیں۔

قرآن میں اِس اہم ترین حقیقت کو اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: 'لَا يَصْلٰهَآ اِلَّا الْاَشْقَى' (اللیل ۹۲:۱۵)، یعنی جہنم میں وہی داخل ہو گا جو بڑا ہی بد بخت ہو، جو کھلم کھلا تکذیب اور روگردانی کا طریقہ اختیار کرے۔ اِسی حقیقت کو قرآن کے ایک دوسرے مقام پر اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: 'وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ' (الاعراف ۷:۳۶)، یعنی جو لوگ ہماری باتوں کو جھٹلائیں اور کبر و نخوت کے ساتھ اُس سے روگردانی کا طریقہ اختیار کریں، وہی جہنمی ہیں، اور وہ اِس جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔

خدا اِس معاملے میں کیا چاہتا ہے، درج ذیل آیت میں اُس پر بہت اچھی طرح روشنی ڈالی گئی ہے: 'مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا' (النساء ۴:۱۴۷)، یعنی خدا کے بندو، اگر تم شکر گزاری کا طریقہ اختیار کرو اور سچے مومن بن کر رہو تو اللہ تمھیں کس لیے عذاب دے گا؟ اللہ تو بڑا قبول کرنے والا اور ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِسی حقیقت کو اِس طرح بیان فرمایا ہے:

عن أبي هريرة، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: «كل أمتي يدخلون الجنة إلا من أبى»، قالوا: يا رسول الله، ومن يأبى؟ قال: «من أطاعني دخل الجنة، ومن عصاني، فقد أبى».

(بخاری، رقم ۷۲۸۰)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت کے تمام لوگ جنت میں جائیں گے، سوائے اُن لوگوں کے جنھوں نے انکار کیا۔ صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ، انکار کون کرے گا؟ فرمایا: جو میری اطاعت کرے گا، وہ جنت میں داخل ہو گا اور جو میری نافرمانی کرے گا، اُس نے انکار کیا۔''

عن أبي أمامة الباهلي قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: «ألا، كلكم يدخل الجنة إلا من شرد على الله شِراد البعير على أهله».

(احمد، رقم ۲۲۲۲۶)

''حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ یاد رکھو، تم میں سے ہر شخص جنت میں داخل ہو گا، سوائے اُس آدمی کے جو اللہ کی اطاعت سے اِس طرح بدک کر نکل جائے، جیسے اونٹ اپنے مالک سے بدک جاتا ہے۔''

اِس قول رسول میں ’إلّا مَنْ شَرَدَ علَى اللهِ شِرادَ البعير‘ کے الفاظ بے حد اہم ہیں۔ یہ الفاظ زیر بحث موضوع سے متعلق ارشاد رسول کی اصل منشا و معنویت کو واضح کر رہے ہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ خدا کے خلاف بدکنے والے اونٹ (جانور) کی طرح بدک کر اُس کے مقابلے میں سرکشی کا طریقہ اختیار کر لیں، یہی وہ لوگ ہیں جو خدا کی جنت اور رحمت کے بجاے ذلت اور غضب کی راہ کے مسافر بن گئے، اور اِسی ذلت اور خدائی غضب کا دوسرا نام جہنم ہے۔ البتہ، جو اہل ایمان امید اور رَجا کے درمیان زندگی گزاریں، اللہ کی رحمت سے یقینی امید ہے کہ اللہ اُنھیں ضرور معاف فرما کر اپنی بخشش اور اپنی ابدی رحمتوں سے سرفراز کرے گا۔

خدا کا سچا دین انسانوں کے لیے دین رحمت ہے۔ وہ بندوں کے نام خداے رحمٰن اور رحیم کا ایک خوب صورت تحفہ ہے، اِلّا یہ کہ آدمی خود دین رحمت کو اپنے لیے دین زحمت بنانے پر کمربستہ ہو جائے۔ اِسی طرح زندگی کا ہر موقع خدا کی یاد کا ایک موقع (occasion) ہے، بشرطیکہ آدمی اپنے لیے اُس کو خدا کی یاد کے ایک زندہ موقع میں تبدیل کر سکے۔

(۱۵/ دسمبر ۲۰۲۳ء)

کوکب شہزاد

غیر مسلم اور زکوٰۃ اور قربانی کا گوشت

سوال: کیا غیر مسلموں کو زکوٰۃ اور قربانی کا گوشت دیا جاسکتا ہے؟

جواب: اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اس کا موضوع پوری انسانیت ہے۔ اسلام کے پانچ ارکان ہیں: توحید، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ۔ لیکن بیش تر جگہوں پر نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ہی آیا ہے، کیونکہ یہی دو چیزیں باقی دین کو بنیاد فراہم کرتی ہیں۔ سورۂ توبہ (۹: ۵) میں ہے کہ جو لوگ نماز پڑھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو۔ ان سے کسی اور چیز کا مطالبہ نہ کرو۔

کسی بھی اسلامی ملک میں مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم بھی رہتے ہیں۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ زکوٰۃ صرف مسلمانوں کو دی جاسکتی ہے، غیر مسلم اگر ضرورت مند ہوں تو انھیں صدقہ اور خیرات ہی دیے جائیں گے اور زکوٰۃ پر صرف مسلمان ضرورت مند لوگوں کا حق ہے، لیکن پورے قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی زکوٰۃ کے مستحقین کا ذکر آیا ہے، اس میں مسلم اور غیر مسلم میں کوئی فرق نہیں کیا گیا۔ سوسائٹی کے تمام لوگوں کو زکوٰۃ کا حق دار ٹھیرایا گیا ہے۔ سورۂ توبہ میں ہے:

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ وَالۡمَسٰکِیۡنِ وَالۡعٰمِلِیۡنَ عَلَیۡهَا وَالۡمُؤَلَّفَةِ قُلُوۡبُهُمۡ وَفِی الرِّقَابِ وَالۡغٰرِمِیۡنَ وَفِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ وَابۡنِ السَّبِیۡلِ ؕ فَرِیۡضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ. (۹: ۶۰)

”(انھیں بتا دو کہ) صدقات تو درحقیقت فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں اور اُن کے لیے جو اُن کے نظم پر مامور ہوں، اور اُن کے لیے جن کی تالیف قلب مطلوب ہے۔ نیز اِس لیے کہ گردنوں کے چھڑانے میں اور تاوان زدوں کے سنبھالنے میں اور خدا کی راہ میں اور مسافروں کی

بہبود کے لیے خرچ کیے جائیں۔ یہ اللہ کا مقرر کردہ فریضہ ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔''

اس آیت میں 'صدقہ' کا لفظ ہر طرح کے انفاق کے لیے استعمال کیا گیا ہے، اور زکوٰۃ اور صدقات کا جن لوگوں کو مستحق قرار دیا گیا ہے، وہ سوسائٹی کے فقرا، مساکین، زکوٰۃ کے شعبے میں کام کرنے والے لوگوں کی تنخواہیں اور ان لوگوں کو دینا جن کی دل جوئی مطلوب ہو، غلاموں کو آزاد کرنے کے لیے، مقروض لوگوں کے قرضے اتارنے کے لیے، اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے کے لیے اور مسافروں کے لیے خرچ کی جاسکتی ہے اور ان مستحقین میں اللہ تعالیٰ نے کہیں مسلم اور غیر مسلم کی شرط نہیں لگائی۔ پورا قرآن مجید اس سے خالی ہے کہ اس میں کہا گیا ہو کہ زکوٰۃ کے حق دار صرف مسلمان ہیں۔

حضرت عمر نے تو اپنے دور حکومت میں تالیف قلب کے ضمن میں سرحدوں پر بیٹھے ہوئے غیر مسلموں کو زکوٰۃ دی تاکہ ان کی دل جوئی ہو سکے اور وہ اسلام دشمن طاقتوں سے نہ جا ملیں۔

یہ غلط فہمی ایک روایت کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوئی۔

ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت معاذ بن جبل کو یمن کا حکمران بنا کر بھیجنے لگے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل کو چند نصیحتیں کیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت معاذ بن جبل کی یہ گفتگو روایت میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

عن بن عَبَّاسٍ رضي الله عنهما قال: قال رسول اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم لِمُعَاذِ بن جَبَلٍ حين بَعَثَهُ إلى الْيَمَنِ: «إِنَّكَ سَتَأْتِي قَوْمًا من أَهْلِ الْكِتَابِ فإذا جِئْتَهُمْ فَادْعُهُمْ إلى أَنْ يَشْهَدُوا أَنْ لَا إِلَهَ إلا الله وَأَنَّ مُحَمَّدًا رسول اللّٰهِ فَإِنْ هُمْ أطاعوا لك بِذَلِكَ فَأَخْبِرْهُمْ أَنَّ اللّٰهِ قد فَرَضَ عليهم خَمْسَ صَلَوَاتٍ في كل يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ فَإِنْ هُمْ أطاعوا لك بِذَلِكَ فَأَخْبِرْهُمْ أَنَّ اللّٰهِ قد فَرَضَ عليهم صَدَقَةً تُؤْخَذُ

''حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجتے وقت فرمایا کہ بے شک، تم اہل کتاب کی ایک قوم کی طرف جاؤ گے۔ تم جب ان کے پاس جاؤ تو ان سے کہنا کہ تم گواہی دو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ اگر وہ تمھاری اطاعت کر لیں تو ان کو بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر دن اور رات میں تم پر پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔

من أَغْنِيَائِهِمْ فَتُرَدُّ على فُقَرَائِهِمْ فَإِنْ هُمْ أطاعوا لك بِذَلِكَ فَإِيَّاكَ وَكَرَائِمَ أَمْوَالِهِمْ وَاتَّقِ دَعْوَةَ الْمَظْلُومِ فإنه ليس بَيْنَهُ وَبَيْنَ اللهِ حِجَابٌ». (بخاری، رقم ۴۰۹۰)

اگر وہ اس پر بھی تمھاری اطاعت کر لیں تو ان کو بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر زکوٰۃ فرض کی ہے، جو تمھارے امیروں سے لی جائے گی اور تمھارے ضرورت مندوں میں تقسیم کی جائے گی۔ اگر وہ اس پر بھی تمھاری اطاعت کر لیں تو اس بات سے بچو کہ تم ان کا بہترین مال چن لو۔ اور مظلوم کی آہ سے بچو۔ بے شک، اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان پردہ نہیں۔"

یہاں غلط فہمی کا باعث روایت کے یہ الفاظ بنے ہیں: 'تُؤْخَذُ من أَغْنِيَائِهِمْ فَتُرَدُّ على فُقَرَائِهِمْ فَإِنْ هُمْ أطاعوا لك بِذَلِكَ فَإِيَّاكَ وَكَرَائِمَ أَمْوَالِهِمْ وَاتَّقِ دَعْوَةَ الْمَظْلُومِ فإنه ليس بَيْنَهُ وَبَيْنَ اللهِ حِجَابٌ'۔

اس روایت میں دونوں جگہ پر 'هم' کا مرجع مسلمانوں کو لیا گیا ہے، جب کہ یہاں پر مخاطب سوسائٹی کے لوگ ہیں جن میں مسلمان بھی ہیں اور غیر مسلم بھی۔ اس روایت میں یہ بیان کیا ہے کہ سوسائٹی کے امیروں سے زکوٰۃ لی جائے گی اور سوسائٹی کے فقرا کی طرف لوٹا دی جائے گی۔ ضمیر کا مرجع غلط متعین کرنے کی وجہ سے یہ رائے بنی کہ زکوٰۃ صرف مسلمانوں کو دی جا سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ اس کائنات کا بادشاہ ہے اور دنیا کے بارے میں اس کا قانون ہے کہ یہاں اس کی نعمتیں ہر ایک کو دی جائیں گی، البتہ آخرت کا وعدہ صرف متقین کے لیے ہے۔

قرآن مجید میں سورۂ بقرہ میں حضرت ابراہیم اور اللہ تعالیٰ کا مکالمہ بڑے خوب صورت طریقے سے بیان ہوا ہے اور اس سے اس دنیا کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا قانون پوری طرح واضح ہو جاتا ہے اور ہم پر زکوٰۃ کی تقسیم میں مسلم اور غیر مسلم کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کا منشا بھی واضح ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ

"اور یاد کرو، جب ہم نے (سرزمین عرب میں) اِس بیت الحرام کو لوگوں کا مرجع اور اُن کے لیے پناہ کی جگہ قرار دیا اور حکم دیا کہ ابراہیم کی اِس قیام گاہ میں نماز کی ایک جگہ بناؤ اور ابراہیم و اسمٰعیل کو اِس

السُّجُوْدِ. وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ.

(البقرہ ۲: ۱۲۵-۱۲۶)

بات کا پابند کیا کہ میرے اِس گھر کو اُن لوگوں کے لیے پاک رکھو جو (اس میں) طواف کرنے، اعتکاف کرنے اور رکوع و سجود کرنے کے لیے آئیں۔ اور یاد کرو، جب ابراہیم نے دعا کی کہ اے پروردگار، اِس شہر کو امن کا شہر بنادے اور اِس کے لوگوں میں سے جو اللہ اور قیامت کو ماننے والے ہوں، اُنھیں پیداوار کی روزی عطا فرما۔ (اللہ نے) فرمایا: اور جو منکر ہیں، (ان چیزوں سے) چند روز کے لیے فائدہ اٹھانے کی مہلت تو میں اُنھیں بھی دوں گا، پھر اُن کو دوزخ کے عذاب میں پکڑ بلاؤں گا اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔''

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو ہر امتحان میں کامیاب ہونے پر انھیں دنیا کا امام بنانے کی خوش خبری دی اور جب حضرت ابراہیم نے اپنی اولاد کی امامت کے بارے میں پوچھا تو اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ امامت کی اس ذمہ داری کا وعدہ صالحین کے بارے میں ہے، گم راہ لوگوں کے بارے میں میرا یہ وعدہ نہیں ہے، البتہ دنیا کا رزق میں سب کو دوں گا۔ کافروں اور نافرمانوں کو اور مسلمانوں کو بھی دوں گا، البتہ گم راہ لوگوں کو میں آخرت میں زبردست عذاب کی طرف گھسیٹوں گا۔ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کی یہ دنیا سب کے لیے ہے، کیونکہ یہ دنیا دار الامتحان ہے۔ اس کی یہ نعمتیں سب کے لیے ہیں۔ سورج کی یہ روشنی سب کے لیے ہے۔ چاند کی یہ ٹھنڈی روشنی سب کو دکھائی دیتی ہے۔ ستارے سب کے لیے چمکتے ہیں اور صحراؤں اور سمندروں میں سفر کرنے والوں کو راستہ دکھاتے ہیں۔ سبزہ، اناج، پھل، پھول، دریا، پہاڑ، وادیاں اور ٹھنڈی ہوائیں سب کے لیے چلتی ہیں۔ چاہے ایمان والے ہوں یا نہ ہوں۔ البتہ آخرت کی ابدی نعمتیں اور بادشاہت صرف اس امتحان میں پاس ہونے والوں کے لیے ہوں گی۔

اللہ تعالیٰ جب اپنی مخلوق پر اپنا کرم کرنے والا ہے تو ہم کون ہوتے ہیں اس مخلوق سے اس پروردگار کی نعمتیں چھیننے والے؟

اب آئیں، ہم منطقی انداز میں بات کرتے ہیں۔ اگر آپ کے گھر میں ایک ملازم ہے، جو کہ مسلمان نہیں۔ اس

کا بچہ اچانک سخت بیمار ہو گیا ہے۔ اس کو اس کے علاج کے لیے پیسے چاہییں اور آپ کے پاس صرف زکوٰۃ کے پیسے رکھے ہوئے ہیں تو کیا آپ اس بچے کی زندگی بچانے کے لیے صرف زکوٰۃ کے پیسے اس لیے نہیں دیں گے کہ وہ غیر مسلم ہے یا عیسائی ہے؟

اسی طرح ہم ایک اور بات کی بھی تصحیح کرنا چاہتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں اکثر یہ تصور بھی پایا جاتا ہے کہ ہم عید الاضحیٰ پر جو قربانی کرتے ہیں، اس کا گوشت بھی غیر مسلموں کو نہیں دیا جا سکتا۔ ہمارے ہاں گھروں میں کام کرنے والوں کی اکثریت عیسائیوں کی ہوتی ہے اور کتنی غیر اخلاقی بات لگتی ہے کہ ان کے سامنے ہم سب لوگوں کو گوشت دیں اور گھر میں خود بھی پکا کر کھائیں، لیکن ان کو گوشت نہ دیں، جب کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کا کھانا خود بھی کھا سکتے ہیں اور اپنا کھانا ان کو دے سکتے ہیں۔ اس وقت کے معاشی حالات میں نچلے طبقے کے لیے گوشت کھانا تقریباً ناممکن ہو چکا ہے اور قربانی کے موقع پر ہم ان مستحقین کو گوشت کھلا سکتے ہیں۔ اس موقع پر ان کے سامنے خود تو گوشت کھانا اور انھیں محروم رکھنا کسی طرح بھی اللہ تعالیٰ کی رضا کا باعث نہیں بن سکتا۔ اگر ہم دنیا میں اسلام پھیلانا چاہتے ہیں اور لوگوں کو انسانیت کا درس دینا چاہتے ہیں تو ان لوگوں کے درمیان مروت، بھائی چارہ، عفو و درگذر اور ہر موقع پر ان کے کام آنے کا رویہ اختیار کرنا ہو گا۔ کسی موقع پر خود کو برتر ظاہر کرنا اور دوسروں کو حقیر سمجھنا انتہائی نامناسب بات ہے۔ کوئی کتنا افضل ہے اور کوئی کتنا کم تر ہے، اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کو کرنے دیجیے اور آپ اپنا کام کیجیے۔

معاذ بن نور

وحی اور سائنس کا ٹکراؤ

[جناب جاوید احمد غامدی کی ویڈیوز کی ٹرانسکرپشن پر مبنی سوال و جواب]

سوال: قرآن اور سائنس میں بظاہر ٹکراؤ پیدا ہو جائے تو کیا ہمیں اپنے فہم قرآن کی کوئی تاویل نہیں کر لینی چاہیے، جو سائنس کے نتائج کے مطابق ہو، کیونکہ سائنس تو دو اور دو چار کی طرح حقائق کو واضح کر رہی ہے؟

جواب: تاویل کرنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہے، البتہ ہم اپنے فہم پر نظر ثانی کریں گے، یعنی اگر کوئی ایسی چیز سامنے آئے گی اور ہم قرآن مجید سے کوئی بات (اس کے خلاف) سمجھے ہوئے ہیں تو دوبارہ قرآن پر غور و فکر کریں گے۔ لیکن غور و فکر کا یہ عمل اسی طرح سے ہو گا، جس طریقے سے اس سے پہلے ہم کرتے رہے ہیں، یعنی لفظ کا مطلب کیا ہے، جملے کی تالیف کیا ہے، سیاق و سباق کیا ہے؟

یعنی سائنسی طور پر کسی چیز کے سامنے آنے کے بعد قرآن مجید پر غور و فکر کا طریقہ تبدیل نہیں ہو جائے گا۔ اس طریقے سے اگر کسی غلطی کی طرف توجہ ہو جاتی ہے تو اللہ کا شکر ادا کریں گے کہ (سائنس کی تحقیق کی بنیاد پر) یہ چیز سامنے آئی، جس کے نتیجے میں ہمیں دوبارہ غور و فکر کا موقع ملا اور ہمارے فہم میں جو غلطی تھی وہ ہم پر واضح ہو گئی۔

لہٰذا نظر ثانی کرنا اور دوبارہ دیکھنا یہ تو لازم ہے اور ہر موقع پر کرنا چاہیے۔ اس میں صرف سائنس نہیں، کسی جگہ پر کوئی لفظی تحقیق سامنے آ جاتی ہے تو اس کو بھی دیکھنا چاہیے۔ کوئی صاحب علم نحو میں کسی تالیف کی طرف

توجہ دلا دیتا ہے، اس وقت بھی دیکھیں گے۔ (کسی معاملے میں بھی) جب بھی کوئی نئی تحقیق سامنے آئے گی اگر وہ ہمارے فہم سے متصادم ہے تو ہم اپنے فہم کو ضرور دوبارہ زیر غور لائیں گے۔

تاہم قرآن مجید کی تاویل کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تاویل کا مطلب یہ ہے کہ لفظ، جملے کی تالیف اور سیاق و سباق تو کہیں اور لے جا رہے ہیں، لیکن چونکہ ایک سائنسی چیز سامنے آگئی ہے تو ہم یا لفظ میں تغیر کریں گے یا تالیف (اور سیاق و سباق) کو نظر انداز کر کے بات بنا دیں گے۔ تاویل کے معاملے میں تو ہمیشہ سے میں یہ کہتا ہوں کہ اگر میں اس طرح کی جسارت کبھی کروں تو پھر زمین کا پیٹ میرے لیے بہتر ہے۔

(تاہم اگر کبھی اس نظر ثانی کے باوجود قرآن کسی سائنسی مقدمہ کو قبول کرنے سے انکار کر دے، اگرچہ) اس وقت تک تو (قرآن کے نزول کے) پندرہ صدیوں بعد بھی ہمیں سائنس اور قرآن میں ٹکراؤ کی کوئی صورت حال پیش نہیں آئی، لیکن اگر کبھی یہ پیش آ بھی گئی تو میں (سائنس سے) یہ کہوں گا کہ تمھاری نگاہ اور تمھاری تحقیق غلطی کر سکتی ہے، اللہ کی کتاب میں غلطی نہیں ہو سکتی۔[1]

سوال: کیا سائنس اور فلسفہ کے ساتھ تعلق انسان کو اچھا مومن بننے سے روکتا ہے؟

جواب: یہ بالکل ضروری نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سائنس تو اللہ کی بڑی قیمتی نعمت ہے، اس کے نتیجے میں بڑی سہولتیں انسان کے لیے پیدا ہوئی ہیں۔ تجربات اور مشاہدات نے کیا کچھ انسان کو دیا ہے، کتنی بیماریوں کے علاج دریافت ہو گئے ہیں۔ سرجری بجائے خود ایک بہت بڑی نعمت ہے انسان کے لیے۔ ہم جب پرانے زمانے کے معاملات دیکھتے ہیں تو (یہ سوچ کر) رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ انسان (ماضی میں) ان تکلیفوں کا کیا (حل) کرتا ہو گا۔ اگر آپ غور کر کے دیکھیے تو انسان پر سائنس کے بڑے احسانات ہیں۔

(لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ) انسان بعض اوقات اسی زندگی کو اصل بنا لیتا ہے، اسی میں غلطاں رہتا ہے اور اسی کے تجربات و مشاہدات اس کے وجود کا احاطہ کیے رکھتے ہیں، اس لیے بعض اوقات وہ اس سے بالکل ہی بے نیاز ہو جاتا ہے کہ کوئی موت بھی ہو گی اور اس کے بعد بھی کچھ معاملات ہو سکتے ہیں، یعنی اس رویے کے نتیجے میں بے نیازی اپنی آخری حد تک پیدا ہو جاتی ہے۔

فلسفہ کا معاملہ بھی یہی ہے۔ وہ چونکہ انسان کو یہ سکھاتا ہے کہ وہ چیزوں کی تحلیل کرے تو اس تحلیل کے نتائج دنیا میں بھی نکلتے ہیں۔ آخر یہ فلسفیانہ افکار ہیں جنھوں نے موجودہ دنیا کو وجود پذیر کرنے میں بڑا کردار ادا کیا

۱-https://youtu.be/wOfD2bKdv-Y?si=GpYsA_4zpZXJBHeC

ہے۔ بہت بڑے فلسفی ہیں جنھوں نے انسانی افکار کی تحلیل کی ہے۔ مذہبی لوگوں نے جو استبداد پیدا کر دیا تھا، اس کے خلاف جدوجہد کی ہے۔ دنیا میں جمہوریت اور اس طرح کے بہت سے نظام وجود پذیر کرنے میں بڑی مدد کی ہے۔ بہت سے سماجی علوم بہت ترقی یافتہ صورت میں سامنے آئے ہیں۔ تاہم فلسفہ (کے ساتھ تعلق) میں بھی بعض اوقات (انسان کے ہاں) یہ خیال (پیدا) ہو جاتا ہے کہ دنیا کا (بس یہی) مسئلہ تھا، جو ہم نے حل کر لیا ہے۔ اب (ماننے کے لیے اور) کیا چیز (رہ گئی) ہے۔

میرے نزدیک انسان کو ہر علم کو اس کی اصل (بنیاد پر) کھڑے ہو کر سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے اور یہ طے نہیں کر لینا چاہیے کہ آپ کو کسی ایک علم ہی کی بنیاد پر آخری فیصلے صادر کرنے ہیں۔ آپ کے اندر طالب علمانہ رویہ پیدا ہونا چاہیے۔

میں نے بہت سے لوگوں کو دیکھا ہے جو موجودہ جدید دور، جدید ریاست اور فلسفے و سائنس کی کامیابیوں کو دیکھ کر مذہب کے ساتھ جو رویہ اختیار کرتے ہیں، وہ مذہب کی تضحیک کا رویہ ہوتا ہے۔ ان کو اس کا بھی احساس نہیں ہوتا کہ اس کے ماننے والوں کی کتنی بڑی تعداد ہے۔ وہ مذہب کے ان پہلوؤں کو نمایاں کرنا شروع کر دیتے ہیں جن میں لوگوں نے مذہب کا غلط استعمال کر کے کوئی تخریب پیدا کر دی۔ ان کو مذہب میں خیر وصلاح کے پہلو نظر آنا بند ہو جاتے ہیں۔ وہ ہمارے ساتھ چلیں تو ہم ان کو دکھائیں کہ ہمارے قدیم مدرسوں اور خانقاہوں نے کس درجے کے متقی، پرہیزگار اور انسانیت کا درد رکھنے والے لوگوں کو پیدا کیا ہے، لیکن (مذہبی افکار کی) چند تخریبی صورتوں کو سامنے رکھ کر وہ بعض اوقات ان کی تعمیم شروع کر دیتے ہیں۔

لہٰذا علوم کے بارے میں انسان کا رویہ مثبت ہونا چاہیے اور انسان کو اپنے حدود کو سمجھ کر طالب علم بن کر رہنا چاہیے، یعنی میں ہر چیز کا جائزہ لوں گا اور جن چیزوں کو نہیں مان رہا، ان کے معاملے میں بھی اس جگہ کھڑا ہوں کہ جب تک میرے پاس (کسی علم کے) انکار کے قطعی دلائل نہیں آ جاتے، میں اس امکان کو مانتا ہوں کہ پیغمبروں، صوفیا اور سائنس دانوں سمیت ہر کسی کی بات درست ہو سکتی ہے۔ جب تک ان چیزوں کے بارے میں یہ امکان مان کر بات نہ کی جائے، میرے خیال میں طالب علمانہ رویہ پیدا نہیں ہو سکتا۔

یہ طالب علمانہ رویے کوئی ایک ہی علم ضروری نہیں کہ پیدا کرے، یہ تو ہر ہر علم کی ضرورت ہیں۔ مذہبی علم میں بھی انسان نے ایک خاص طرح کے جمود اور ایک خاص دور کے علم کی تقلید کو اپنا کر طالب علمانہ رویوں کا کم و بیش خاتمہ کر دیا۔

اصل چیز یہ نہیں ہے کہ (طالب علمانہ رویے کا خاتمہ) کیا سائنس نے ایسا کیا یا مذہب نے؟ اصل چیز یہ ہے کہ

ہمارے اندر جو انسان ہے کیا ہم نے اس انسان کو اس کے (حدود علم سے آشنا کر کے) صحیح خطوط پر استوار کر لیا ہے؟ کیا ہم اپنے علم میں غلطی کے امکان کو تسلیم کر کے دنیا کے ساتھ بات کرنا سیکھ گئے ہیں؟ کیا ہم دوسروں کے افکار کا احترام کرنا سیکھ گئے ہیں؟ کیا ہم نے بات کہنے کے مہذب اسالیب اپنا لیے ہیں؟ اگر یہ ہم سیکھ گئے ہیں تو پھر امن ہی امن ہے۔ اگر ہم نے یہ نہیں سیکھا تو مذہبی ہو کر بھی ہم تخریب کریں گے، فلسفی ہو کر بھی ہم تخریب کریں گے اور سائنس دان ہو کر بھی ہم تخریب کریں گے۔[۲]

سوال: کیا مذہب فلسفہ اور سائنس کے ساتھ مقابلے کی حالت میں ہے؟

جواب: مذہب ہمارے اندر رکھے گئے فطری حقائق پر مبنی اللہ تعالیٰ کی ہدایت کا نام ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ہم اپنی فطرت کے لوازم کو دریافت کر کے خود مذہبی حقائق کو تشکیل دیتے ہیں۔ اس کے برعکس، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت آتی ہے۔ اس ہدایت کے نزول کے لیے وہ خود کسی انسان کا انتخاب کرتے ہیں۔ جیسے آدم کو اللہ نے مبعوث کیا۔ پھر جو فطرت اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو دی ہے، اسی فطرت کو ہمیں عقل کی روشنی میں سمجھے جانے کے قابل بنایا۔ اسی فطرت کو بنیاد بنا کر اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت نازل کر دی۔

اس لحاظ سے مذہب کی تعلیمات اصلاً خبر پر مبنی ہیں اور وہ خبر انسانی فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہوتی ہے۔ انسانی عقل بھی یہ سمجھ لیتی ہے کہ یہ ٹھیک نتائج ہیں، جو ہمارے سامنے نکال کر رکھ دیے گئے ہیں۔ گویا عقل وہاں اس وقت کام کرتی ہے جب خبر اس کو میسر آجاتی ہے۔ اس دائرے میں مذہب کا موضوع انسانوں کو یہ بتانا ہے کہ یہ دنیا جو تمھیں دی گئی ہے، اسی پر زندگی ختم نہیں ہو رہی، اس کے بعد ایک نئی دنیا آنے والی ہے جس میں تمھیں اپنے پروردگار کے سامنے پیش ہونا ہے۔ اسی پیشی کے لیے انسان کو تیار کرنا، دراصل مذہب کا موضوع ہے۔

فلسفہ یہ دیکھے گا کہ انسانی عقل جن نتائج کو اخذ کرتی ہے، اس پورے عمل میں انضباط پیدا کر کے اس کے قاعدے بنائے جائیں اور معروضی اور موضوعی چیزوں کو بنیاد بنا کر انسانی علم کو آگے بڑھنے کا موقع دیا جائے۔

سائنس اس دنیا پر اپنی توجہات مرکوز کرے گی، تجربے اور مشاہدے کے حاصلات کو سامنے رکھ کر عقلی استنباط کی طرف جائے گی اور پھر کلیات بنا کر ایجادات میں داخل ہو جائے گی۔

اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو مذہب، فلسفہ اور سائنس میں باہم تعلق بھی ہے، لیکن ان کے دائرے بالکل

۲-https://youtu.be/cw5KbJz8lcc?si=SLo0pbRr6ufRYC-q

الگ ہیں اور یہ ان دائروں ہی میں کام کریں تو اس سے خیر وصلاح پیدا ہوتا ہے۔

لٰہذا جو لوگ (مذہب، فلسفہ اور سائنس کے ان دائروں کو خلط کر کے) یہ استدلال کرتے ہیں کہ پیغمبروں نے انسان کو کیا دیا ہے؟ کیا کوئی ایجادات پیش کی ہیں؟ کیا حیاتیاتی حقائق اور معیشت و معاشرت سے متعلق دنیوی مسائل کا کوئی حل پیش کیا ہے؟ یہ لوگ مذہب کا موضوع سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔[۳]

۳-https://youtu.be/cw5KbJz8lcc?si=itwsNNSi5BWrRhvc

شاہد رضا

غیر مسلم کے ساتھ کھانا پینا

[جناب جاوید احمد غامدی کی تحریروں، آڈیوز اور ویڈیوز سے اخذ و استفادہ پر مبنی مختصر سوال و جواب]

سوال: کیا غیر مسلموں کے ساتھ یا ان کے برتن میں کھایا پیا جا سکتا ہے؟

جواب: غیر مسلموں کے ساتھ یا ان کے برتن میں کھانے پینے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کوئی اچھوت نہیں بنایا ہے۔ ہم دنیا میں انسان، بھائی اور آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ کھا اور پی سکتے ہیں۔ البتہ کچھ چیزوں کو حرام کیا گیا ہے۔ وہ چیزیں مسلمانوں کے دستر خوان پر بھی حرام ہیں اور غیر مسلموں کے دستر خوان پر بھی حرام ہیں۔ آدمی کو خواہ مخواہ اس شک میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ غیر مسلم کون سی چیز پیش کر رہے ہیں یا وہ اس میں کون سی چیز استعمال کر رہے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ آپ نے کہیں دعوت پر جانا ہے تو ان کو بتا دیں کہ ہمارے ہاں یہ چیزیں حرام ہیں یا ان چیزوں کو منع کیا گیا ہے۔ چنانچہ حرام و حلال کا معاملہ بالکل واضح ہے، اس کا کسی مسلمان یا غیر مسلم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر آپ کے لیے سؤر کھانا ممنوع قرار دیا گیا ہے تو وہ کسی کے بھی دستر خوان پر ہو گا، وہ ممنوع ہی ہو گا۔ اس کا کسی مسلمان یا غیر مسلم سے تعلق نہیں ہے۔

اسی طرح ذبیحہ کا معاملہ ہے۔ ایک مسلمان اگر اس کے آداب کی پیروی نہیں کرتا تو اس کو بھی نہیں کھایا جا سکتا۔ غیر مسلموں کے بارے میں جہاں ہمیں معلوم ہے کہ وہ فلاں چیز کی پیروی نہیں کرتے تو ظاہر ہے کہ ہم وہ نہیں کھا سکتے۔ اس وجہ سے اس کی بنیاد یہ نہیں ہے کہ یہ غیر مسلم کا کھانا ہے، بلکہ بنیاد یہ ہے کہ کیا وہ کھانا اللہ تعالیٰ کے قانون اور قاعدے کے مطابق بنا ہے؟ وہ قانون، قاعدے اور حرمت و حلت کے آداب ہمیں بتا دیے گئے ہیں، اور وہ واضح احکام ہیں، یعنی ذبح اور جانوروں کے بارے میں ایک قاعدہ بتاتے ہوئے ایک عمومی ہدایت دے دی گئی ہے کہ طیبات تمھارے لیے حلال ہیں اور خبائث، یعنی بری چیزیں حرام ہیں۔[1]

1-https://ghamidi.com/videos/eating-and-drinking-with-non-muslims-2082

محمد بلال

حیات امین احسن

(۱۰)

باب ۱۰

نسیان کا عارضہ

۱۹۷۱ء کے آخر میں امین احسن کو نسیان کی بیماری لاحق ہو گئی۔ بیماری کی شدت ایسی تھی کہ وہ اشیا اور افراد کی پہچان بھی نہ کر پاتے۔ لکھنے لکھانے کا کام بھی بند ہو گیا۔ ان کی تفسیر کی اہمیت سمجھنے والے لوگ اس کی تکمیل سے مایوس ہو گئے۔ عقیدت مندوں نے صحت کے لیے دعائیں کیں اور منتیں مانیں۔ امین احسن کے لیے یہ بہت مشکل زمانہ تھا۔ بھولنے کا عارضہ اس قدر شدید صورت اختیار کر چکا تھا کہ یہ بھی بھول جاتے تھے کہ یہ جو صاحب ملنے آئے ہیں، یہ کون ہیں۔ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں ان کی ساری یاد داشت ہی نہ ختم ہو جائے اور انھوں نے اتنی محنت کر کے جو علم حاصل کیا ہے، وہ اس سے محروم ہی نہ ہو جائیں۔ اور بعض لوگ خط لکھا کرتے تھے کہ اللہ کرے کہ ہماری عمر آپ کو لگ جائے تاکہ آپ اپنا تفسیر کا کام کر سکیں۔ امین احسن کہا کرتے تھے کہ اگر میں مزید کام نہ بھی کر پایا تو اتنا کام ہو چکا ہے کہ جو نظم قرآن کو سامنے لے آئے۔

لاہور کے تمام اہم ڈاکٹروں سے علاج کرایا، مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ پھر کراچی کے نام ور دماغی معالج ڈاکٹر جمعہ سے علاج کرنا طے پایا۔ کراچی میں مقیم امین احسن کے ہم زلف چودھری اقبال صاحب نے علاج کرانے اور اپنے ہاں قیام کرنے کی پیش کش کی۔ ڈاکٹر جمعہ کی تشخیص کے مطابق بہت زیادہ دماغی محنت

نے دماغ کی شریانوں کو سخت کر دیا تھا، جس سے خون کی گردش میں دشواری ہوئی اور اسی سے نسیان کی کیفیت پیدا ہوئی۔

ڈاکٹر کے تجویز کردہ علاج سے چند ہفتوں میں افاقہ ہونا شروع گیا۔ الفاظ کی یادداشت بحال ہو گئی، جملوں میں ربط پیدا ہو گیا اور افراد کی پہچان لوٹ آئی۔ صحت پاتے ہی اپنے شاگرد خالد مسعود صاحب کو یاد کیا اور انھیں خط لکھوا کر صورت حال سے مطلع کیا۔ احباب کو اندیشہ تھا کہ بیماری سے علمی سرمایہ نہ بھول گئے ہوں۔ کراچی میں مقیم امین احسن کے دوست شیخ سلطان احمد صاحب نے ان سے درس کی فرمایش کی۔ سورۂ حدید کا درس ہوا۔ شیخ صاحب درس سن کر خوشی سے نہال ہو گئے۔ انھوں نے خالد مسعود صاحب کو یہ خوش خبری لکھ بھیجی کہ بیماری نے ان کے علم کو بالکل کوئی نقصان نہیں پہنچایا، درس حسب سابق بہت مدلل اور موثر تھا۔

مئی ۱۹۷۲ء میں امین احسن لاہور واپس آئے۔ اب وہ خاصے صحت مند ہو چکے تھے۔ خالد مسعود ملنے گئے تو انھوں نے کہا کہ انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت عقل ہے۔ اسی کے باعث انسان اشرف المخلوقات ٹھیرا۔ اس بیماری میں مبتلا کر کے اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ حقیقت واضح کر دی کہ انسان اپنی جس صلاحیت پر ناز کر سکتا ہے، اللہ تعالیٰ پلک جھپکنے میں اس کو سلب کر سکتا ہے۔ میری بیماری نے میرے اوپر بعض حقائق منکشف کیے ہیں۔ اگر میں اس تجربے سے نہ گزرتا تو ان پر میرا یقین اتنا پختہ نہیں ہو سکتا تھا۔ مثلاً یہ مسئلہ کھلا کہ قرآن پر گہری نظر سے وہ صحیح ایمان پیدا ہوتا ہے جو مصائب میں سہارا بنتا اور مشکلات میں پریشانی سے بچاتا ہے۔ اگر ایک آزمایش سے گزر کر آدمی کچھ ایسی باتیں سمجھ لے جو بڑھاپے میں سہارا دینے والی ہوں تو یہ قیمت کچھ زیادہ نہیں ہے۔

۹/ جون ۱۹۷۲ء کو امین احسن نے کئی ماہ بعد نماز جمعہ ادا کی۔ وہ اس پر بے حد مسرور تھے۔ کہنے لگے: اگرچہ مجھے یہ تسلی تھی کہ میں بیماری کے باعث نماز جمعہ کی حاضری سے محروم ہوں، لیکن مجھے اس حدیث کی وجہ سے وحشت ہوتی تھی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص لگاتار جمعہ کی تین نمازوں میں حاضر نہ ہو تو اللہ کو اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی کہ وہ یہودی ہو کر مرتا ہے یا نصرانی ہو کر۔ مجھے پریشانی یہ تھی کہ میں کئی ماہ گزر جانے کے باوجود اس پر قادر نہیں ہو رہا ہوں۔

جون میں امین احسن کام کرنے کے قابل ہو گئے۔ کہنے لگے: اب میری صحت اچھی ہو رہی ہے، لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کام کی کیا شکل ہو گی اور تفسیر کیسے لکھی جائے گی۔ خالد مسعود صاحب نے مشورہ دیا کہ آپ سورۂ کہف اور اس کے بعد کی سورتوں کو زیر مطالعہ رکھیں۔ حلقۂ تدبر قرآن کے ساتھی بھی انھیں پڑھتے رہا

کریں اور فی الحال ان کی مشکلات کے بارے میں آپ سے سوالات کریں۔ امین احسن نے اس مشورے پر عمل کیا اور علمی مجالس منعقد ہونے لگیں۔ ۳؍ جولائی سے امین احسن نے سورۂ کہف کا درس باقاعدہ دینا شروع کیا اور اس کے لیے ہفتے میں دو دن مخصوص کیے۔ چند ہفتوں بعد امین احسن نے محسوس کیا کہ اب وہ تفسیر لکھ سکتے ہیں، بشرطیکہ حلقے کے رفقا بھی اس کام میں شریک ہو جائیں۔ چنانچہ خالد مسعود، غلام احمد اور محمود احمد لودھی صاحبان کی معاونت سے تفسیر کا کام پھر سے شروع ہو گیا۔

Monthly
ISHRAQ
Lahore

July 2024
Vol.36 No.7
Regd. No. CPL-183

Publisher: javed Ahmad Ghamidi. Printers: Qaumi Press, 50 Lower Mall Lahore

ماہنامہ ’’اشراق‘‘ کی اشاعت کئی دہائیوں سے جاری ہے۔ ’’اشراق‘‘ کی تاریخ بہت درخشاں ہے۔ اِس نے دین کی علمی خدمت کے کارہاے نمایاں انجام دیے ہیں۔ اِس نے دین کی اشاعت وفروغ میں بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ اِس نے اپنے قارئین کے شعوری افق میں نئے در وا کیے ہیں۔ اِس نے دین کے ساتھ وابستگی کو رواجی سے اٹھا کر شعوری اور قلبی بنایا ہے۔ شکست خوردگی کے آزار کا درماں بنا ہے۔ دین سے دوری کے اسباب کا سد باب کیا ہے۔ دین پر اعتماد کو بحال کیا ہے۔ غرض یہ کہ دین کی ہمہ جہت خدمت اِس کا منشور ہے۔

قارئین ہر جریدے کی زندگی کا سبب ہیں۔ جو لوگ ’’اشراق‘‘ کے ساتھ وابستہ ہیں، وہ اِس کے دست و بازو بھی ہیں۔ ’’اشراق‘‘ کی انتظامیہ توقع کرتی ہے کہ اِس کے قارئین اِس کی دعوت کے نقیب بھی بنیں۔

البیان

یہ قرآن مجید کا اردو ترجمہ ہے۔ آں سوے افلاک کے اِس شہ پارۂ ادب کا حسن بیان تو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں ہے۔ مصنف نے، البتہ اِس ترجمے میں یہ کوشش کی ہے کہ اِس کا مدعا نظم کلام کی رعایت سے اردو زبان میں منتقل کر دیں۔ تراجم کی تاریخ میں یہ اِس لحاظ سے پہلا ترجمۂ قرآن ہے کہ اِس میں قرآن کا نظم اُس کے ترجمے ہی سے واضح ہو جاتا ہے۔ اِس کے لیے مزید کسی شرح و وضاحت کی ضرورت نہیں رہتی۔

ترجمے کے حواشی زیادہ تر استاذ امام امین احسن اصلاحی کی تفسیر ’’تدبر قرآن‘‘ کا خلاصہ ہیں۔ مصنف کا نقطۂ نظر جن مقامات پر اُن سے مختلف ہے، وہ بھی کم نہیں ہیں۔ اہل نظر تقابلی مطالعے سے اُنھیں خود متعین کر سکتے ہیں۔ ترجمہ و تفسیر کی کتابوں میں ہر جگہ اِس کا اظہار ممکن نہیں ہوتا۔

امید ہے کہ نظم کلام کے ساتھ قرآن کے اسلوب بیان کا جلال و جمال بھی ارباب ذوق اِس ترجمے میں کسی حد تک جلوہ فرما دیکھ سکیں گے۔

میزان

اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ کم و بیش ربع صدی کے مطالعہ و تحقیق سے مصنف نے اِس دین کو جو کچھ سمجھا ہے، وہ اپنی اِس کتاب میں بیان کر دیا ہے۔

المورد
ادارۂ علم و تحقیق